خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
مارچ 2020
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول
www.pklibrary.com

زبان کو جلا یا لیکن اسے پروا نہیں تھی۔

''امیر کو ابوبکیٰ کی گرفتاری کے سلسلے میں زیادہ تردد نہیں ہے۔ وہ جس علاقے میں گیا ہوا ہے، وہاں کا امیر، امیر ارغل کے گہرے دوستوں میں سے ایک ہے۔ امیر کی طرف سے پیغام بھیجے جانے پر وہ اسے ازخود بھی گرفتار کر کے یہاں بھجوا سکتا ہے لیکن تم تسلی رکھو..... امیر نے علی الصباح ایک دستہ ابوبکیٰ کی گرفتاری کے لیے روانہ کر دیا ہے۔ جلد ہی ابوبکیٰ اپنے ساتھیوں کے ساتھ قید خانے میں سلاخوں کے پیچھے ہوگا۔''

''اب تمہیں ابوبکیٰ کے بجائے اپنے حال کی فکر کرنی چاہیے دوست! ابوبکیٰ اب تمہارے بجائے امیر محترم کا مسئلہ ہے۔'' سلیمان جو اس ساری گفتگو کے دوران خاموشی سے میزبانی کے فرائض انجام دیتا رہا تھا، اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو وہ چونک گیا۔

''میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔''

''مطلب یہ کہ تمہارے امیر سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کے امکانات بہت روشن ہیں۔ اس ملاقات سے قبل تمہیں اپنا حلیہ سدھارنا ہوگا۔ امیر تم سے ایک قیدی کے بجائے معزز مہمان کی حیثیت سے ملاقات کرنا پسند کریں گے۔'' سلیمان نے اسے اپنی بات کا مطلب سمجھایا تو اس نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی لیکن پھر خیال آنے پر بول پڑا۔

''ایک لٹا پٹا غریب الوطن مسافر امیر سے ملاقات کے لائق حلیہ بنانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ میری بے اسبابی کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا امیر میرے حلیے سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔''

''اب تم قصر کے معزز مہمان ہو۔ اس لیے تمہیں اپنے بے اسباب ہونے کا تصور بھی نہیں کرنا چاہیے۔ تمہارا معائنہ اور ذہنی الجھنیں دور کرنا مقصود نہ ہوتا تو میں قید خانے سے تمہیں سیدھا اس مہمان خانے میں لے جاتا جہاں امیر محترم کے حکم سے تمہاری رہائش کا انتظام مکمل کیا جا چکا ہے۔'' سلیمان نے اسے اطلاع دی تو وہ تقدیر کی اس کایا پلٹ پر زیرلب مسکرا کر رہ گیا۔ سردار سے ایک زیرستم قیدی اور قیدی سے ایک امیر کے معزز مہمان کے مراحل اتنی تیزی سے طے ہوئے تھے کہ اسے کچھ سوچنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

☆☆☆

''تو تم ہو وہ نوجوان جس کی بدولت ہم ایک بھیانک سازش سے آگاہ ہوئے۔'' ساشا سے مخاطب شخص نے بے حد قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں بیش قیمت پتھروں سے مزین انگوٹھیاں موجود تھیں۔ گلے میں سچے موتیوں کی مالا اور دائیں کان میں ہیرے جڑی بالی جھول رہی تھی۔ اس کا فربہ جسم اور بیٹھنے کا تساہل بھرا انداز ظاہر کر رہا تھا کہ اس نے زندگی میں کبھی محنت و مشقت سے کام نہیں لیا اور ہمیشہ عیش و عشرت کے مزے لوٹتا رہا ہے۔ وہ امیر ارغل تھا۔ اس قصر کا مالک اور اردگرد کے علاقے کا بے تاج بادشاہ۔

''جی ہاں، میں ہی وہ خوش قسمت ہوں جسے امیر کی یہ خدمت انجام دینے کا شرف حاصل ہوا ہے۔'' وہ میزاجا سرکش ندی کی طرح تھا لیکن یہ اس کے دانا باپ کی تربیت تھی جو اسے امیر ارغل جیسے لوگوں سے گفتگو کے قرینے کا بھی علم تھا۔

''ہم تمہیں تمہاری اس خدمت کا خاطر خواہ انعام دیں گے۔ تمہاری وجہ سے ہم اپنی زندگی کے بدترین حادثے سے محفوظ رہنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔'' امیر کے اندازِ گفتگو سے ظاہر تھا کہ رکھ رکھاؤ کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کے باوجود وہ اندر سے مضطرب ہے۔

''آپ کی خوشنودی ہی میرا سب سے بڑا انعام ہے۔ ابوبکیٰ کے ہاتھوں میری گرفتاری یقیناً آپ کے خلاف ہونے والی سازش کو طشت از بام کرنے کے لیے قدرت کی طرف سے ایک مدد تھی۔'' اس بار بھی اس نے عاجزی سے کام لیا۔

''ہمارے سامنے اس غدار کا نام نہ لو۔ اس کا نام سن کر ہمارا خون کھولنے لگتا ہے۔ ہم نے اسے عزت دی اور اس نے ہماری ہی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی سازش تیار کر ڈالی۔'' امیر کا چہرہ غصے کی زیادتی سے سرخ پڑ گیا۔ فوراً ہی اس کے دائیں جانب کھڑی کنیز حرکت میں آئی اور اس کے ہاتھ میں موجود پیمانے کو سرخ شراب سے بھر ڈالا۔ امیر نے ایک ہی سانس میں ساری شراب اپنے حلق سے نیچے اتار لی اور پیمانہ اٹھا کر دور پھینکا۔ شاید اس کی نیت پیمانے کو دیوار پر دے مارنے کی تھی لیکن فاصلہ زیادہ تھا اور امیر کے مشقت سے ناواقف بازوؤں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ پیمانے کو یہ درمیانی فاصلہ طے کروا پاتے اس لیے وہ دیوار تک پہنچنے کے بجائے درمیان میں ہی گر گیا اور فرش پر بچھے دبیز قالین کی وجہ سے ٹوٹنے سے محفوظ رہا۔ کنیز نے لپک کر پھرتی سے گرا ہوا پیمانہ اٹھا لیا۔

''مجھے اندازہ ہے کہ اس شخص کی غداری نے آپ کو صدمہ پہنچایا ہے لیکن آپ کو اطمینان ہونا چاہیے کہ اب بھی آپ کے اردگرد بہت سے وفادار اور جاں نثار موجود ہیں۔'' اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو ذرا سا خم دیا تو امیر ارغل اسے غور سے دیکھنے لگا۔ چند لمحے نظروں ہی نظروں

میں اسے جانچا اور پھر بولا۔

''ہم نے سنا ہے کہ تم ایک تاجر ہو جو ملکوں ملکوں قیمتی جواہرات اور کپڑے وغیرہ فروخت کرتے پھرتے ہو۔ ایک تاجر سے ہم اپنے لیے کس خدمت کی امید کر سکتے ہیں؟''

''آپ نے میرے متعلق جو کچھ سنا ہے مجھے اس سے انکار نہیں لیکن میں آپ کی یہ غلط فہمی دور کر دینا چاہتا ہوں کہ ایک تاجر کے بازوؤں میں تلوار اٹھانے کی طاقت نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ کو میری جانچ مقصود ہو تو اپنے کسی بھی شمشیر زن سے مقابلہ کروا کر دیکھ سکتے ہیں۔ اگر آپ کو میری شمشیر زنی کی صلاحیت متاثر نہیں کر سکی تو بھی آپ میری زبان دانی کی صلاحیت سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ایک صاحبِ اختیار شخص کو مجھ جیسے آدمی کی ضرورت ہمیشہ ہوتی ہے۔'' وہ امیر سے ملاقات کی اطلاع ملنے کے بعد سے مسلسل اس کے دربار میں اپنی جگہ بنانے کے بارے میں سوچتا رہا تھا اس لیے پہلا موقع ملتے ہی اس سلسلے میں گفتگو شروع کر دی۔

''ہم تمہاری خواہش کا خیر مقدم کرتے ہیں لیکن ہم حیران ہیں کہ ایک کامیاب تاجر کو ہماری ملازمت میں کیا کشش محسوس ہو رہی ہے؟'' امیر کے ہاتھوں میں ایک نیا پیمانہ آ چکا تھا اور اس سے گھونٹ گھونٹ مشروب حلق میں انڈیلتا وہ آنکھوں میں تجسس لیے ساشا سے پوچھ رہا تھا۔ مؤدب اور سجی سنوری کنیزیں امیر کے روبرو بیٹھے اس کے مہمان کی مدارت میں بھی پیچھے نہیں تھیں لیکن ساشا امیر کے مقابلے میں بہت سست روی سے پی رہا تھا اور انہیں بہت کم اس کی خدمت کا موقع مل سکا تھا۔

''مجھے امیر کی کشادہ دلی کی اطلاعات اور اپنی کسمپرسی نے اس درخواست کی ہمت عطا کی ہے۔ جیسا کہ آپ کو خبر ہو گی کہ میں ایک چھوٹی ریاست کا باشندہ ہوں تو میرے بارے میں یہ گمان رکھنا کہ میں کوئی بہت زیادہ مالدار تاجر ہوں، درست نہ ہو گا۔ ہاں یہ اتفاق ضرور تھا کہ زیادہ منافع کی خواہش میں، اس بار میں اپنے کل مال و متاع کے ساتھ تجارتی قافلہ لے کر گھر سے نکلا تھا اور امید رکھتا تھا کہ جب لوٹ کر واپس اپنے گھر جاؤں گا تو پہلے کے مقابلے میں زیادہ خوش حال ہو چکا ہوں گا لیکن قسمت کی ستم ظریفی کہ لٹیروں نے شب کی تاریکی میں اس طرح ہمارے قافلے پر حملہ کیا کہ ہمیں سنبھلنے کا موقع نہیں مل سکا۔ یقیناً ہماری تباہی میں رات کے پہرے داروں کی غفلت کا بھی عنصر شامل ہو گا لیکن اب کسی کو موردِ الزام ٹھہرانے اور تفتیش سے گزارنے کا موقع ہی کہاں ہے؟ آج کی سچائی بس اتنی ہے کہ میں لٹیروں کے ہاتھ سے اپنی جان کے سوا کچھ بھی بچا کر لانے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور ان خالی ہاتھوں کے ساتھ لوٹ کر گھر واپس جاؤں گا تو وہاں گھر کا انتظام و انصرام سنبھالنے والے ملازمین کے لیے چھوڑے گئے تھوڑے سے اناج اور محدود رقم کے سوا ایسا کچھ نہیں ہے جو مجھے دوبارہ سے معاشی طور پر مضبوط بنانے میں مدد دے سکے..... ایسے میں میرے پاس آپ سے یہ گزارش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ آپ مجھے اپنی خدمت کا موقع عنایت فرمائیں۔'' اسے اپنے قدم جمانے کے لیے زمین کی ضرورت تھی اور وہ پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ اسے امیر ارغل کے ساتھیوں کے درمیان اپنی جگہ بنانی ہے۔ اس لیے اتنی دلسوزی سے وہ جھوٹی داستان سنا رہا تھا جو امیر کے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا کر سکے۔

''ہمیں تمہارے حالات جان کر گہرا دکھ ہوا۔ بہرحال جب تک تم یہاں ہو خود کو بے سروساماں محسوس کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ تم چاہو تو غیر معین مدت کے لیے ایک معزز مہمان کی حیثیت سے بھی قصر میں رہ سکتے ہو، بصورتِ دیگر تمہارے لیے تمہاری حسبِ خواہش کسی ملازمت کا انتظام بھی کر دیا جائے گا۔'' امیر کا جواب اس کی امیدوں اور خواہشات کے مطابق تھا۔

''میں آپ کی خدمت کو اپنے لیے باعثِ فخر محسوس کروں گا۔'' اس نے ادب سے جواب دیا جسے سن کر امیر مسکرایا۔ ابھی اس کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے جدا نہیں ہوئی تھی کہ ایک خدمت گار نے باریابی کی اجازت چاہی۔ اس مداخلت پر امیر کی تیوریوں پر بل پڑے۔ ساشا سے اس ملاقات کے دوران اس کی خاص کنیزوں کے سوا کسی کو وہاں موجود رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایسے میں اسے یہ مداخلت ناگوار نہ گزرتی تو کیا ہوتا لیکن پھر وہ کسی خیال سے چونکا۔ اس کے حکم سے سرتابی کا مطلب تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آ چکا ہے۔ اس نے خدمت گار کو اندر آنے کی اجازت دے دی۔

''کیا ہم اس مداخلت کی وجہ جان سکتے ہیں؟'' امیر نے اپنے سامنے مؤدب کھڑے ہونے والے خدمت گار کے بندھے ہاتھ اور جھکی نگاہیں دیکھیں اور بھویں اچکا کر پوچھا۔

''ابوبکیٰ کی گرفتاری کے لیے آپ کے دوست امیر سفیان کی خدمت میں درخواست لے کر جانے والا دستہ واپس آ چکا ہے اور دستے کا سالار آپ کے حضور باریابی کی اجازت کا خواست گار ہے۔'' خدمت گار نے مدعا بیان کیا۔

UUNOVELS.COM

''وہ صادق..... وہ ہماری توقع سے جلدی واپس آ گیا۔ اسے جلد از جلد ہماری خدمت میں پیش کیا جائے۔ وہ ہمیں ابوبکیٰ کی گرفتاری کی خوش خبری سنانے کے لیے بے قرار ہوگا۔'' امیر اطلاع سن کر کھل اٹھا اور بڑبڑانے کے سے انداز میں مزید بولا۔

''بہت ممکن ہے کہ ہمارے دوست امیر سفیان نے صادق کے ہاتھ ہمیں کوئی پیغام بھیجا ہو اور صادق اس پیغام کو جلد از جلد ہم تک پہنچا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہو۔''

امیر کے جوش و خروش اور خوش فہمیوں سے قطع نظر ساشا کی نگاہیں خدمت گار کے چہرے کے تاثرات کھوجتی رہی تھیں۔ وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا اور امیر سے نظریں ملانے سے گریز کر رہا تھا۔ ممکن ہے امیر نے اس کی جھکی نظروں کو اپنے ادب و احترام پر محمول کیا ہو لیکن ساشا کی نظریں کچھ اور دیکھ رہی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ خدمت گار جس شخص کے لیے اذنِ باریابی طلب کرنے آیا ہے، وہ شخص امیر کے لیے کم از کم خوشی کی کوئی خبر لے کر نہیں آیا۔ ہوگا۔ مذکورہ شخص اندر آیا تو اس کے چہرے پر چھائے مایوسی، حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات نے اس کے اندازے کو مزید تقویت بخشی۔ اس بار امیر بھی چونک گیا۔

''کیا بات ہے صادق! ہم تمہارے چہرے پر وہ تاثرات نہیں دیکھ رہے جو ایک کامیاب مہم سے واپسی پر ہمیں نظر آنے چاہیے تھے۔''

''مجھے افسوس ہے امیر محترم لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں آپ کے لیے کوئی اچھی خبر لانے سے قاصر رہا ہوں۔'' اس شخص نے پست آواز میں جواب دیا۔

''کیا مطلب؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' جتنا اس کا لہجہ پست تھا امیر نے اتنے ہی بلند لہجے میں سوال کیا۔

''میں آپ کے حکم کی تعمیل میں ابوبکیٰ کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔'' امیر کو غصے میں آتا دیکھ کر صادق کی آواز لرزنے لگی تھی۔

''کیا ابوبکیٰ تمہارے وہاں پہنچنے سے قبل فرار ہو چکا تھا؟''

''اگر ایسا ہوتا تو آپ کا یہ خادم دنیا کے آخری کنارے تک اس کا تعاقب کرتا۔''

''ہم سے معموں میں بات نہ کرو صادق؟''

''ابوبکیٰ کو آپ کے دوست امیر سفیان اپنی پناہ میں لے چکے ہیں۔ انہوں نے اسے میرے حوالے کرنے سے قطعی انکار کر دیا ہے۔'' صادق کی دی اطلاع امیر ارغل پر بجلی بن کر گری۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟ امیر سفیان..... ہمارا دوست..... وہ ہمارے ایک غدار کو کیسے پناہ دے سکتا ہے۔ تم نے اسے بتایا ہوتا کہ تم ہمارے حکم پر ابوبکیٰ کو گرفتار کرنے پہنچے ہو۔'' امیر کی حیرت دور نہیں ہو رہی تھی جبکہ اس کے قریب بیٹھا ساشا اس صورتِ حال کو اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔

''میں نے انہیں سمجھایا تھا کہ ابوبکیٰ کو پناہ دینا ہمارے امیر محترم کی دوستی سے کنارہ کش ہونے کے مترادف ہوگا۔''

''پھر اس نے کیا جواب دیا؟'' امیر نے بے تابی سے پوچھا۔

''ان کا کہنا تھا کہ ابوبکیٰ جیسے کارآمد آدمی کے حصول کے لیے.....'' صادق اپنا جملہ مکمل نہیں کر سکا۔

''ہم امیر سفیان کا مکمل ارشاد سننا چاہتے ہیں۔'' صادق کے رکنے پر امیر ارغل نے غرانے کے انداز میں اسے ٹوکا۔

''ایک مفاد پرست دوست کے گستاخانہ جملے کو دہراتے میری زبان جلتی ہے امیر محترم.....'' صادق نے معذوری کا اظہار کیا۔

''ہم اپنے سگے بھائی کی طوطا چشمی سہہ سکتے ہیں تو ایک دوست کے گستاخانہ الفاظ سننے کے لیے بھی ہماری سماعتوں میں گنجائش ہے۔ ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ ہمیں امیر سفیان کے خیالات سے لفظ بہ لفظ آگاہ کیا جائے۔''

''ان کا کہنا تھا کہ ابوبکیٰ جیسے کارآمد آدمی کے حصول کے لیے.....'' صادق ایک بار پھر رکا لیکن امیر کی گھورتی نظروں کی تاب نہ لا کر لرزتی آواز میں جملہ مکمل کر ہی لیا۔

''امیر ارغل جیسے نکمے دوست کا ساتھ چھوڑ دینا کوئی مہنگا سودا نہیں۔''

امیر ارغل اگرچہ خود پوری بات جاننے کے لیے اصرار کر چکا تھا پھر بھی صادق کا جملہ مکمل ہونے پر اس کا چہرہ بے پناہ سرخ ہو گیا اور وہ یوں طیش کے عالم میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوا جیسے ابھی صادق کی زبان کھینچ لے گا۔

''میری کوئی خطا نہیں امیر محترم! میں نے صرف آپ کے اصرار پر امیر سفیان کی بات.....'' صادق کو یقیناً اپنی خیریت مشکوک نظر آنے لگی تھی جو ہاتھ جوڑتے ہوئے وضاحت پیش کرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن امیر ارغل نے اسے اپنی بات مکمل نہیں کرنے دی۔ اس کا دایاں ہاتھ بلند ہوتے ہی صادق کی زبان بند ہو گئی۔

UQNOVELS.COM

''تم اب جا سکتے ہو۔ آنے والا وقت جلد سفیان کو بتا دے گا کہ امیر ارغل کی دوستی سے محرومی کتنا مہنگا سودا ہے۔''
امیر کے بھینچے ہوئے جبڑے اس کے اندر جوش مارتے غیظ و غضب کا پتا دے رہے تھے۔ صادق کے جانے کے بعد بھی وہ سخت طیش کے عالم میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہا۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی چہیتی کنیزیں کمرے کے گوشوں میں سمٹ گئیں اور وہاں ایسا ہُو کا عالم ہو گیا جیسے کوئی ذی نفس موجود ہی نہ ہو۔ اپنی جگہ پر بیٹھا ساشا بھی بالکل ساکت تھا جبکہ امیر کا یہ حال تھا کہ وہ گویا اپنے سوا وہاں پر کسی کی موجودگی سے بے نیاز ہو چکا ہو۔ کافی دیر اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے گزارنے کے بعد ساشا کو بے چینی ہونے لگی۔ ماحول پر چھایا جمود توڑنے کے لیے وہ دھیرے سے کھنکھارا تو گوشوں میں سمٹی کنیزوں کے چہرے یوں فق ہو گئے جیسے اس نے کسی سوئے ہوئے عفریت کو جگانے کی غلطی کر ڈالی ہو۔
''اوہ..... تم ابھی تک یہیں ہو؟'' امیر اس کے کھنکھارنے پر چونکا اور اس کی جانب دیکھ کر استعجاب سے بولا۔
''امیر محترم کی اجازت کے بغیر خادم کے قدموں میں جنبش کی تاب نہیں تھی۔'' روم میں رہ کر رومی بن جانے کے مقولے کے مصداق اس نے بھی امیر کے نمک خواروں کا سا لہجہ اختیار کیا۔
''ٹھیک ہے، اب تم جا سکتے ہو۔ کل ہم تمہیں ایک ایسا دلچسپ تماشا دیکھنے کے لیے دعوت دیں گے جواب سے قبل تم نے شاید کبھی نہ دیکھا ہو۔'' امیر ارغل کی آنکھوں میں ایک بھیڑیے کا سا غضب اور کینہ دکھائی دینے لگا۔ ساشا جیسا بے جگر اور نڈر آدمی بھی اس کی آنکھوں کے تاثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اس نے امیر کی آنکھوں میں خون کی بھوک پڑھ لی تھی۔ وہ یہ بھوک کس کے خون سے مٹائے گا، اس سوال کا جواب اسے آنے والے دن میں ہی مل سکتا تھا۔

☆☆☆

گھوڑے کی پشت پر موجود سوار کے چہرے کی معصومیت اور نرمی اس کی کم سنی کا اعلان کر رہی تھی اور وہ جس طرح نڈھال سا گھوڑے کی گردن سے لپٹا ہوا تھا، اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ یا تو زخمی ہے یا طویل اور کٹھن مسافت نے اس کی ساری طاقت سلب کر لی ہے۔ گھوڑا بھی کچھ اس انداز سے چل رہا تھا جیسے اس کے لیے ہر قدم دوبھر ہو لیکن چلتے چلے جانے کے سوا کوئی چارہ بھی نہ ہو۔
''تمہارا بہت شکریہ دوست! تم نے اپنی طاقت سے بڑھ کر میرا ساتھ دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہم ان ظالموں سے بہت دور نکل آئے ہیں اور اب ہمارے پاس اتنی گنجائش ہے کہ کچھ دیر آرام کر سکیں۔ وہ دیکھو..... وہ درختوں کا ایک جھنڈ نظر آ رہا ہے۔ اگر تم وہاں تک چلنے کی ہمت کر سکو تو ہم ان درختوں کے سائے میں زیادہ بہتر طور پر آرام کر سکیں گے۔'' نوجوان سوار جس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوئی جا رہی تھیں اور درد سے بدن کا ہر جوڑ ٹوٹ رہا تھا، گھوڑے کی گردن سے لپٹے لپٹے یوں سرگوشی میں بولا جیسے یقین ہو کہ گھوڑا اس کی ہر بات سمجھ رہا ہو۔ تھکے ماندے گھوڑے نے اس کے اس یقین کی تائید میں سر اٹھا کر درختوں کے جھنڈ کی طرف دیکھا اور ہنہنا کر اپنا رخ اس کی طرف کر دیا۔ سوار نے طمانیت کے گہرے احساس کے تحت آنکھیں بند کر لیں۔ پل بھر کے لیے شاید اسے جھپکی بھی آ گئی تھی چنانچہ جب دوبارہ آنکھیں کھول کر دیکھا تو خود کو گھوڑے سمیت درختوں کے جھنڈ کے درمیان پایا۔
''تھکن کی شدت سے مجھ میں تو کھانے پینے کی بھی ہمت نہیں ہے۔ تم یہاں لگی تازہ گھاس اور درختوں کے پتوں سے شغل کرو لیکن میری پہلی ترجیح آرام ہے۔'' سوار جس نے عربی طرز کا لباس پہنا ہوا تھا، گھوڑے سے نیچے اتر کر اپنے کہنے کے مطابق سبز اور نرم گھاس پر دراز ہو گیا۔ سرہانے کے طور پر اس نے اپنے جسم پر موجود بڑی سی چادر کو بل دے کر اس طرح گولائی میں لپیٹ لیا تھا جیسے کوئی سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہو۔ لمحہ بھر میں ہی اس کی نیند سے بوجھل آنکھیں بند ہو گئیں اور شدید تھکن کی غماز گہری اور بوجھل سانسیں سنائی دینے لگیں۔ سوئے ہوئے نہ جانے کتنی دیر گزری تھی کہ گھوڑے کی تیز ہنہناہٹ نے اسے جاگنے پر مجبور کر دیا اور ایک خودکار عمل کے تحت اس نے سونے سے قبل سرہانے کے نیچے رکھا جانے والا خنجر کھینچ نکالا۔
''خنجر پھینک دو نوجوان! تم اس وقت بہترین تیر اندازوں کے گھیرے میں ہو۔ تمہارا یہ معمولی خنجر ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔'' خنجر ہاتھ میں پکڑے اس کی متلاشی نظریں ابھی اِدھر اُدھر بھٹک ہی رہی تھیں کہ ایک چوڑے تنے کے درخت کے پیچھے سے کسی نے بھاری اور گونجیلی آواز میں اسے متنبہ کیا۔
''تم کون ہو اور مجھے اس طرح گھیرنے کا کیا مقصد ہے؟'' نوجوان نے اپنی سراسیمگی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے لہجے کو ذرا مضبوط بنا کر پوچھا۔
''اگر تم ہمیں یقین دلا دو کہ تم سے ہمیں کوئی نقصان

نہیں پہنچے گا تو یقین رکھو کہ ہم تمہارے لیے قطعی بے ضرر ثابت ہوں گے۔"

"میں ایک تنہا شخص بھلا کسی کو کیسے نقصان پہنچا سکتا ہوں۔" نوجوان کے لہجے سے حیرت جھلکی۔

"تنہا شخص اگر ایک جاسوس ہو تو پوری قوم کو بھی تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔" اس بار جواب دینے والے کے لہجے میں تلخی تھی۔

"جاسوس..... کس کا جاسوس!" نوجوان کی حیرت سوا ہوگئی۔

"مجھے تمہاری حیرت پر حیرت ہے۔ یہ بات تو ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ آج کل اپنی جان بچا کر اِدھر اُدھر بھٹکنے والے قافلوں کے پیچھے کس کے جاسوس لگے رہتے ہیں۔" لہجے کی تلخی سوا ہوگئی۔

"میں بہت دور سے سفر کرتا ہوا اس علاقے میں پہنچا ہوں اور خود ایک بھٹکا ہوا مسافر ہوں۔ میں بھلا کس کے لیے جاسوسی کروں گا۔" نوجوان نے اداس لہجے میں جواب دیا۔

"پھر تمہیں خیر سگالی کے اظہار کے لیے اپنا خنجر اب تک پھینک دینا چاہیے تھا۔"

"یہ صرف خود حفاظتی کے لیے ہے۔" نوجوان نے وضاحت دی، جواب میں بیک وقت کئی تیر اس کے قریب سے سنسناتے ہوئے گزرے اور اردگرد کے درختوں کے تنوں میں پیوست ہوگئے۔ سراسیمہ نوجوان کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل کر رہ گئیں۔

"تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ تم اس خنجر سے کس حد تک اپنا دفاع کر سکتے ہو اس لیے بہتر ہے کہ اب اسے پھینک دو تاکہ ہم ایک دوسرے کے روبرو گفتگو کر سکیں۔"

نوجوان میں تاب نہیں رہی تھی کہ سخت لہجے میں دیے گئے اس حکم کو ماننے سے انکار کر سکے۔ چنانچہ اس نے نہایت بے بسی کے عالم میں خنجر دور پھینک دیا۔ فوراً ہی درخت کے پیچھے سے ایک دراز قد اور مضبوط جسامت کا جوان برآمد ہوا اور نپے تلے قدم اٹھاتا اس کے سامنے آ ٹھہرا۔ کچھ پل وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے پھر نوجوان نے مقابل کی آنکھوں کی چمک کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی نظریں جھکا لیں۔

"کون ہو تم اور اس علاقے میں کیا کر رہے ہو؟" کاٹ دار لہجے میں سوال کیا گیا۔

"میرا نام قاسم ہے۔ میں اور میرے والد ایک تجارتی قافلے کے ساتھ سفر کر رہے تھے کہ ڈاکوؤں نے ہمارے قافلے پر حملہ کر دیا۔ افراتفری میں ہم سب اپنی جان بچانے کے لیے بھاگے۔ میں بھاگتے بھاگتے دور نکل گیا اور اپنی راہ کھو بیٹھا۔ اب دو دن سے اِدھر اُدھر بھٹکتا پھر رہا ہوں لیکن ابھی تک اپنا قافلہ یا اس کا کوئی ساتھی تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔" نوجوان نے جھکی نظروں کے ساتھ اسے اپنے بارے میں آگاہ کیا۔

"تمہارے والد کا کیا نام ہے؟ کیا وہ تاجر ہیں؟" مقابل کی نظریں اس طرح اس پر جمی ہوئی تھیں جیسے اسے اندر تک کھوج رہی ہوں۔

"ان کا نام ابوبکر ہے۔ وہ کپڑے اور میوہ جات کی تجارت کرتے ہیں۔" نوجوان نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کرنے کی کوشش کی۔

"تمہارا تعلق کس ملک سے ہے؟"

"ملک شام سے۔" نوجوان نے اختصار سے جواب دیا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو۔" اس شخص نے یک دم ہی اپنی تلوار نکال کر اس کی گردن پر رکھ دی۔

"تم مجھ پر یہ الزام نہیں لگا سکتے۔" نوجوان تنک کر بولا۔

"میں صرف الزام نہیں لگا رہا، اسے ثابت بھی کر سکتا ہوں۔ اول یہ کہ تم کوئی شامی نہیں ہو۔ تمہارا لہجہ شامیوں سے قطعی مختلف ہے۔ دوم یہ کہ بے شک تم طویل مسافت کے باعث تھکن کا شکار ہو لیکن یہ جھوٹ ہے کہ تم اپنے قافلے پر ڈاکوؤں کے حملے کے بعد افراتفری میں جان بچا کر بھاگے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو تم تھکن کے علاوہ بھوک و پیاس سے بھی نڈھال ہوتے لیکن میں تمہارے اندر ایسے کوئی آثار نہیں دیکھ رہا۔ میرے اندازے کے مطابق تمہارے گھوڑے کی خرجین میں اب بھی کھانے پینے کی اشیا کا کچھ ذخیرہ موجود ہے اور افراتفری میں بھاگ کھڑے ہونے والے اس قدر انتظام کے ساتھ نہیں بھاگتے۔" وہ اسے گھورتے ہوئے اس کے بارے میں اپنا تجزیہ پیش کر رہا تھا۔ نوجوان نے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا اور سخت لہجے میں بولا۔

"ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی ہے۔ جب میں اپنی بات مکمل کر لوں تو بے شک تم اپنی صفائی میں جو چاہے بول سکتے ہو۔" اس کی تنبیہ پر نوجوان نے اپنے ہونٹ بھینچ کر خاموشی اختیار کر لی۔

"تمہارے بارے میں میرا تیسرا اور آخری اندازہ یہ ہے کہ تم ایک نوجوان لڑکے کے بجائے لڑکی ہو۔" اپنا جملہ مکمل کرتے ہی اس نے تلوار کو جنبش دی۔ اس جنبش کے

UUNOVELS.COM

نتیجے میں نوجوان کے سر پر عربیوں کے مخصوص انداز میں رکھا بڑا سا رومال نما کپڑا اپنے دائرے سمیت دور جا گرا اور نوجوان کی سر کے گرد دائرے کی شکل میں مضبوطی سے لپٹی چوٹی واضح ہوگئی۔

''کیا تاتاریوں کے پاس مسلمانوں کے قافلوں کا کھوج لگانے کے لیے کوئی مرد نہیں بچا تھا جو انہوں نے ایک عورت کو ہماری جاسوسی کے لیے بھیج دیا؟'' اس نے پھنکارتے ہوئے لہجے میں حقارت سے پوچھا۔

''نہیں، بخدا نہیں..... آپ میرے بارے میں بالکل غلط گمان کر رہے ہیں۔ بے شک میں نے اپنے متعلق غلط بیانی سے کام لیا ہے لیکن وہ بھی سچ نہیں جو آپ میرے متعلق سوچ رہے ہیں۔'' وہ جواب تک قصداً آواز کو بھاری کر کے بول رہی تھی، نرم نسوانی لہجے میں بولی تو مقابل پل بھر کے لیے اس کی آواز کی نغمگی میں کھو سا گیا لیکن پھر اسے جلد ہی اس کی مشکوک حیثیت اور اپنا فرض یاد آ گیا اور دانستہ لہجے کو سخت بنا کر بولا۔

''میں تمہارا سچ سننا چاہتا ہوں۔ اس سچ کو پرکھنے کے بعد ہی میں فیصلہ کر سکوں گا کہ تم پر اعتبار کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔''

''مجھے یقین ہے کہ سچ کی طاقت اپنا آپ تسلیم کروا لے گی۔'' اس کے لہجے میں بے پناہ اعتماد در آیا اور وہ قریب کھڑے اپنے گھوڑے کی پشت کو پیار سے تھپتھپا کر ایک بڑے سے پتھر کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

''میری داستان کچھ طویل ہے، آیئے اطمینان سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

''تمہارا گھوڑا لاجواب ہے۔'' اس نے بے ساختہ اس کے گھوڑے کو سراہا اور اپنے جملے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ اس کی وفاداری اور ہوشیاری ہی تھی کہ تم میرے خود تک پہنچنے سے قبل ہوشیار ہو گئیں۔ اگر یہ ہنہنا کر تمہیں نہ جگاتا تو تم میری تلوار کی نوک اپنی گردن میں چبھنے سے ہی جاگتیں۔''

''میں نیند کو ترس چکی تھی اور طویل سفر نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا۔ اس لیے یہ جھنڈ نظر آتے ہی آرام کا فیصلہ کیا۔ اپنے فیصلے پر عمل کرتے ہوئے مجھے اپنے گھوڑے کی ہوشیاری اور وفاداری پر بھرپور اعتماد تھا۔'' وہ جو بڑے سے پتھر پر ایک شہزادی کی سی شان سے بیٹھ چکی تھی، مسکرا کر بولی۔

''اب تم اپنے بارے میں جلدی جلدی سب بتا ڈالو۔ مجھے اور میرے ساتھی کو پڑاؤ سے نکلے بہت دیر ہو چکی ہے۔ زیادہ دیر ہو گئی تو ہمارے باقی ساتھی پریشان ہو جائیں گے۔'' وہ اس کے مقابل ایک درخت کے گرے ہوئے تنے پر بیٹھ گیا۔

''آپ کے ساتھ صرف ایک ساتھی ہے؟'' وہ حیران ہوئی۔ ''مجھ پر جس رفتار سے تیر برسائے گئے تھے، مجھے گمان ہوا تھا کہ میرے اردگرد کم از کم چار تیر باز موجود ہیں۔''

''ہم دو ہی اپنی اس صلاحیت کے باعث دس پر بھاری پڑ سکتے ہیں لیکن اپنی اس غلط فہمی کو دور کر لو کہ وہ تیر تم پر برسائے گئے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو اب تک تمہاری لاش بھی ٹھنڈی ہو چکی ہوتی۔ ہم نے صرف تمہیں تنبیہ کی تھی کہ کسی بھی غلط حرکت سے باز رہو۔''

''بہت خوب۔'' اس نے سراہنے والے انداز میں کہا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''کیونکہ تمہارا وقت قیمتی ہے اور تمہیں اپنے پڑاؤ میں واپس لوٹ کر جانے کی جلدی بھی ہے اس لیے میں تمہارا مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنی داستان بیان کرنا مناسب سمجھوں گی۔'' وہ شروع ہوئی تو روانی سے اپنے بارے میں بہت کچھ بتاتی چلی گئی۔ وہ توجہ سے سب کچھ سنتا ضروری مقامات پر سوالات بھی کرتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے متعلق سب کچھ بتا کر خاموش ہوئی تو کچھ دیر دونوں کے درمیان خاموشی ہی چھائی رہی۔ اس خاموشی کو توڑنے کے لیے وہ مسکرا کر بولا۔

''اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا لیکن ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا۔''

''وہ تو آپ نے بھی نہیں بتایا۔'' اس نے بے ساختہ شکوہ کیا۔

''میں نے تو خیر ابھی اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا لیکن چلو نام بتا دیتا ہوں، میرا نام داؤد بن معیز ہے۔''

''مجھے آپ سارہ کہہ سکتے ہیں۔'' اس کے ہونٹوں سے اوپر ابھی تک وہ باریک مصنوعی مونچھیں موجود تھیں جنہیں اس نے خود کو مردانہ روپ دینے کے لیے چسپاں کیا تھا اور چہرہ سفر کی گرد سے آلودہ تھا پھر بھی داؤد بن معیز نے اس کے ایک قطار میں موجود شفاف موتیوں کی لڑی سے دانتوں کی خوب صورتی میں اس کے حسن کو محسوس کر لیا۔

''سارہ کہہ سکتے ہیں کا مطلب ہے کہ تم سچ مچ سارہ نہیں ہو۔'' اپنی توجہ بٹانے کے لیے اس نے اس کی بات پکڑی۔

''سچ مچ میں کیا ہوں، اس کا جواب تو مجھے بھی نہیں معلوم لیکن جس نام سے اب تک جانی جاتی رہی ہوں، اسے پوشیدہ رکھنے کے پیچھے اپنی ذات کو پوشیدہ رکھنے کی خواہش موجود ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی مجھے تلاشتا ہوا آپ تک پہنچ جائے۔'' اس

UUNOVELS.COM

کی بڑی بڑی آنکھوں میں اداسی تیرنے لگی۔

''کیا تم ہم سے پناہ کی طلب گار ہو؟'' داؤد بن معیز نے اس کا جواب سن کر حیرت سے پوچھا۔

''میں نے پناہ کی امید میں ہی آپ کو اپنے متعلق سب کچھ بتایا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ویرانوں میں طویل مسافت طے کرنے کے باوجود میں اب تک کسی حادثے سے محفوظ رہی ہوں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مجھے ایک محفوظ پناہ کی ضرورت ہے۔''

''میں تو تمہیں بہت مضبوط اور بہادر عورت سمجھ رہا تھا۔''

''کتنی ہی مضبوط اور بہادر سہی، ہوں تو عورت ہی نا اور عورت ہونا میری ایسی کمزوری ہے جو کسی بھی مقام پر مجھے بے بس کر سکتی ہے۔'' اس نے اپنے اس اعتراف سے ثابت کر دیا کہ وہ بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ عقلمند بھی ہے۔

''پناہ کی امید رکھنے سے قبل یہ تو پوچھ لیتیں کہ میں نے تمہاری داستان پر اعتبار کیا ہے یا نہیں؟'' اس کا انداز چھیڑنے والا تھا۔

''مجھے بھروسا ہے کہ سچ کو رد نہیں کیا جا سکتا۔'' اس نے اعتماد سے جواب دیا اور پھر ذرا نخوت سے بولی۔

''مجھ پر تاتاریوں کی جاسوسہ ہونے کا الزام لگانے سے پہلے تمہیں سوچ لینا چاہیے تھا کہ کیا میرے نقوش چپٹی ناک اور چندی آنکھوں والی منگول عورتوں سے کوئی مشابہت رکھتے ہیں۔''

وہ اس کے نازِ حسن پر بے ساختہ امڈ آنے والی مسکراہٹ کو نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر چھپا گیا اور سنجیدگی سے بولا۔

''تاتاری کتنے ہی وحشی اور اجڈ سہی، ان کے بارے میں ایک بات طے ہے کہ وہ بے پناہ چالاک اور عیار قوم ہیں اور اپنی عیاری سے کام لے کر وہ دوسری قوموں میں سے کئی ایسے افراد کو اپنے تسلط میں لے چکے ہیں جو لالچ یا خوف کے تحت ان کے بہت سے مقاصد کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اس لیے ایک غیر منگول عورت کا تاتاریوں کی جاسوسہ ہونا بعید از قیاس نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔''

''ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے لیکن ایک شے ہوتی ہے، آدمی کے دل کی گواہی..... کیا تمہارا دل میرے سچ پر کوئی گواہی نہیں دیتا؟'' اس کا لہجہ نرم لیکن آنکھوں کا تاثر تیکھا تھا۔ داؤد بن معیز کو اس تاثر نے لاجواب کر دیا اور اس نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے گردن کو دائیں رخ پر موڑ کر بلند آواز سے کہا۔

آپ پریشان!
آخر کب تک؟

ہماری معلومات کے مطابق ہر چوتھا انسان اپنی اعصابی کمزوری کی وجہ سے سخت پریشان ہے۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا ہربل اعصابی کورس تیار کیا ہے۔ اگر آپ اپنی گھریلو لائف پُرسکون بنانا چاہتے ہیں تو آپ ہمیں اپنی اعصابی کمزوری سے متعلقہ تمام علامات کے بارے میں فون کریں۔ اور آج ہی بذریعہ ڈاک وی پی VP ہربل اعصابی کورس منگوالیں۔ ان شاء اللہ ہمارا اعصابی کورس آپ کو بے حد طاقت دے گا۔ ہمارا اعصابی کورس سستا آسان اور مختصر ہے

دارلشفاء المدنی
ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان
0301-8149979
0309-1604171
0346-0319995

اوقات رابطہ
صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

''تم سامنے آسکتے ہو عبدالمالک! میں نے خاتون کو اپنے ساتھ پڑاؤ میں لے جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ میں ان کی طرف سے مطمئن ہوں۔'' ردِعمل میں فوراً ہی ایک سولہ سترہ سالہ لڑکا دو گھوڑوں کی باگیں تھامے ہوئے درختوں کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ ان میں سے ایک گھوڑے پر شکار کردہ بھیڑ لدی ہوئی تھی۔ لڑکے نے داؤد کے اشارے پر دور گرا سارہ کا خنجر اٹھا کر اپنے قبضے میں لے لیا۔

''ہمیں بہت طویل سفر درپیش ہے اس لیے موقع ملتے ہی ہم اپنی خوراک کا ذخیرہ بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آج بھی خوراک کی تلاش میں گھومتے گھماتے تم تک آپہنچے تھے۔'' اس نے بھیڑ لدے گھوڑے کی پشت پر سوار ہوتے ہوئے اسے بتایا۔ انداز دوستانہ تھا، یوں جیسے اس نے اسے اپنی ایک ساتھی کے طور پر قبول کرلیا ہو۔ داؤد بن معیز کی یہ مہربانی اس کے لیے نعمت سے کم نہیں تھی۔ اس نے جھٹ دور جا گرنے والا سر کا رومال اور کنڈلی کی طرح لپٹی چادر زمین سے اٹھائی اور دونوں چیزوں سے اپنے سر اور جسم کو ڈھانپ کر گھوڑے پر سوار ہوگئی۔ اس کا ڈھیلا ڈھالا اور قدرے موٹے کپڑے کا لباس پہلے ہی اس کے نسوانی خدوخال کو واضح نہیں ہونے دے رہا تھا۔ چادر کے استعمال نے مزید پردہ پوشی کا انتظام کردیا۔ داؤد اور عبدالمالک کے شانہ بہ شانہ اپنے گھوڑے کو دوڑاتی ہوئی وہ شمال کی سمت ڈیڑھ دو میل آگے پہنچی تو اس کی آنکھوں نے زمین پر نصب خیمے دیکھ لیے۔ خیموں کے باہر بچے کھیل رہے تھے۔ چند بزرگ بیٹھے آپس میں گفتگو کررہے تھے اور تین چار مسلح جوان مختلف مقامات پر کھڑے یقینی طور پر پہرے داری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ان کے گھوڑوں کی اڑائی دھول اور ٹاپوں نے انہیں اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ بچے فوراً بھاگ کر اندر خیموں میں چلے گئے۔ بزرگ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور پہرے دار جوان چوکنے نظر آنے لگے پھر شاید انہوں نے اپنے ساتھیوں کو پہچان لیا۔ دو نوجوان بھاگ کر آگے آئے اور داؤد بن معیز کے گھوڑے پر لدی بھیڑ کو دیکھ کر ایک چہک کر بولا۔

''آخاہ! بھیڑ کا شکار کیا ہے اخی نے۔ آج تو ہم تازہ بھنے ہوئے گوشت سے لطف اندوز ہوں گے۔''

''اسے سنبھالو لطیف لیکن خیال رہے کہ اس کے گوشت پر دعوت اڑانے سے پہلے تمہیں میرے گھوڑے کو ٹہلانے کا انتظام کرنا پڑے گا۔'' داؤد نے خوشگوار لہجے میں جواب دیا اور چھلانگ لگا کر گھوڑے سے نیچے اتر گیا۔

''بہت خوشی سے اخی! یہ گھوڑا اپنی پشت پر ہماری پسندیدہ خوراک کا بوجھ لاد کر لایا ہے، اس کے جسم پر لگے خون کے دھبے دھونے میں ہم راحت محسوس کریں گے۔'' لڑکے کے لہجے کی چہکار برقرار تھی لیکن اب وہ اور اس کے پیچھے موجود دیگر لوگ اس تیسرے سوار کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے جو ان کے لیے اجنبی تھا۔

''انہیں ثریا کے خیمے میں پہنچا دو عبدالمالک! اس سے کہنا کہ ایک مصیبت زدہ کو اس کی توجہ اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔'' اس نے آنکھوں کے سوال نظرانداز کرکے عبدالمالک کو مخاطب کرکے کہا تو وہ سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے خود ہی گھوڑے سے نیچے اتر آئی۔ عبدالمالک نے اپنے اور اس کے گھوڑے کی باگیں ایک لڑکے کو تھما دیں۔ اتنی دیر میں کسی خطرے کے پیش نظر خیموں میں جا گھسنے والے بچے دوبارہ باہر نکل آئے تھے اور دلچسپی سے اجنبی مہمان کو دیکھ رہے تھے۔ اس نے محسوس کرلیا کہ ان بچوں کے علاوہ کچھ پوشیدہ آنکھیں بھی ہیں جو یقیناً خیمے کے دروازوں پر پڑی چلمنوں کے پیچھے سے اسے تاک رہی ہیں۔ عبدالمالک اسے لیے ہوئے ایک خیمے کے سامنے رکا اور ادب سے آواز دی۔

''ہمشیرہ ثریا! اخی نے آپ کو ایک مہمان کی خدمت کا اعزاز بخشا ہے۔''

''زہے نصیب! مہمان کو عزت سے اندر بھجوا دو۔'' چلمن کے پیچھے سے ایک نرم و مہذب نسوانی آواز سنائی دی۔

''اندر تشریف لے جایئے خاتون! ہمشیرہ ثریا کی صحبت میں انشاء اللہ آپ کوئی تکلیف محسوس نہیں کریں گی۔'' عبدالمالک نے مؤدبانہ اس سے کہا تو اس نے قدم آگے بڑھائے۔ چلمن اٹھا کر خیمے کے اندر داخل ہونے سے قبل اس نے پلٹ کر داؤد بن معیز کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے گرد جمع ہوجانے والوں کو دھیمی آواز میں کچھ بتا رہا تھا۔ اس نے داؤد کی روشن اور فراخ پیشانی پر ایک نظر ڈالی اور دل میں یہ یقین لیے اندر داخل ہوئی کہ راستے میں اس نے داؤد کو اپنے متعلق دوسروں کو سچ نہ بتانے کی جو درخواست کی تھی، وہ اس کا خیال رکھے گا۔

☆☆☆

سلیمان کے ساتھ بیٹھا ساشا پرتجسس نظروں سے اپنے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے آس پاس نشستوں پر اور بھی بہت سے لوگ براجمان تھے۔ ان لوگوں میں امیر کے عزیز و اقارب، دوست احباب، خدمت گارو

UUNOVELS.COM

کنیزوں کے علاوہ علاقے کے عام افراد بھی موجود تھے اور تمام لوگوں کو حسب مراتب مختلف مقامات پر بٹھایا گیا تھا۔ وہ لوگ ایک ایسی جگہ موجود تھے جہاں بیٹھنے کے لیے بنائی گئی نشستیں اوپر سے نیچے سیڑھیوں کی طرح تعمیر کیے گئے ایک ایسے چبوترے پر بنائی گئی تھیں جو نیم دائرے کی شکل میں تھا اور نشستوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اپنے سامنے وہ گول میدان نما حصہ اچھی طرح دیکھ سکتے تھے جس کی پوری گولائی کو لوہے کے مضبوط جنگلے نے گھیرا ہوا تھا۔ اس جگہ کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ یہاں کھیلوں کے مقابلے اور مختلف تماشے منعقد کیے جاتے ہوں گے۔ مختصر الفاظ میں یہ جگہ ایک تماش گاہ تھی اور اپنی اپنی نشستوں پر براجمان تماشائی منتظر تھے کہ کل کی منادی کے مطابق آج انہیں یہاں کون سا دلچسپ تماشا دیکھنے کو ملنے والا ہے۔

''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ہمیں یہاں کون سا تماشا دیکھنے کو ملے گا؟'' ساشا جو امیر کے خاص مصاحب کی طرح قیمتی پوشاک میں ملبوس تھا اور بہت سے افراد کی طرح اس کی تلوار اس کی نیام میں لٹکی ہوئی تھی، سلیمان کی طرف جھک کر اس سے پوچھنے لگا۔

''نہیں..... میں نہیں جانتا۔ عموماً اس مقام پر مختلف کھیلوں کے مقابلے منعقد کیے جاتے ہیں یا پھر کبھی کبھی مسخرے، بازی گر اور بھانڈ وغیرہ اپنے کرتب دکھاتے ہیں لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ آج یہاں اس قسم کا کوئی انتظام نہیں جسے دیکھ کر اندازہ کیا جا سکے کہ ہم کس قسم کی تفریح سے لطف اندوز ہونے والے ہیں۔'' نفی میں جواب دیتا ہوا سلیمان خود الجھن کا شکار تھا۔

''یعنی میرے ساتھ ساتھ امیر تم سب کو بھی حیرت سے دوچار کرنے والے ہیں۔'' ساشا نے مسکراتے ہوئے اس حصے کی طرف نظر ڈالی جہاں زرنگار لباس میں چہروں کو نقابوں سے ڈھانپے خواتین اپنی نشستیں سنبھال رہی تھیں۔

''اس طرف مت دیکھو۔ وہ امیر محترم کی اعزاء اور کنیزیں ہیں۔'' سلیمان نے اسے ٹوکا تو اس نے اپنی نظروں کا رخ بدل لیا لیکن اسے چین نہیں تھا۔

''یہ تماشا کب شروع ہوگا؟ میں انتظار کرتے کرتے بیزار ہو گیا ہوں۔''

''تھوڑا سا صبر سے کام لو۔ مستورات کی آمد کا مطلب ہے امیر محترم بھی اب تشریف لایا ہی چاہتے ہیں۔ جو کچھ ہونا ہے ان کی آمد کے بعد ہی ہوگا۔'' سلیمان نے اسے نصیحت کی۔ ابھی اس کے منہ سے بات نکلی ہی تھی کہ نقیب، امیر ارغل کی آمد کا اعلان کرنے لگا۔ تمام لوگ امیر کے استقبال کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ساشا کو بھی ان کی تقلید کرنی پڑی۔ امیر نے اپنی نشست سنبھال لی تو باقی لوگ بھی بیٹھ گئے اور نمایاں مقام پر کھڑے اس شخص کی طرف متوجہ ہوئے جو لوگوں کو متوجہ کرتے ہوئے بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔

''معززین! آپ جانتے ہیں کہ اس تماش گاہ میں آپ کو ہمیشہ دلچسپ اور انوکھی تفریحات سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ آج بھی امیر محترم یہاں ایک منفرد اور انوکھا مقابلہ منعقد کروا رہے ہیں۔ میں واضح کر دوں کہ یہ کھیل منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ لوگوں کے لیے خوفناک بھی ہو سکتا ہے اس لیے جن خواتین و حضرات کے دل کمزور ہیں وہ چاہیں تو یہاں سے تشریف لے جا سکتے ہیں۔''

اس اعلان کے ساتھ ہی وہاں موجود افراد کے درمیان بھنبھناتی چہ میگوئیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ساشا کی نظریں بے ساختہ خواتین والے حصے کی طرف اٹھیں۔ اس نے دیکھا کہ سیاہ لبادے میں ملبوس ایک سرو قامت عورت جس کا چہرہ سیاہ نقاب میں چھپا ہوا تھا، اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے پردے میں ہونے کے باوجود ساشا یہ اندازہ لگانے میں کامیاب رہا کہ وہ ایک جوان العمر اور خوب صورت عورت ہے۔ وہ شاید اعلان کے بعد وہاں سے روانہ ہونے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن فوراً ہی اس کے دائیں بائیں بیٹھی خواتین نے اس کو بازوؤں سے تھام لیا اور نرمی سے نشست پر واپس بٹھانے لگیں۔ خواتین کی اس حرکت پر سیاہ لباس والی عورت نے جھٹکا دے کر اپنے بازو ان کی گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے اس کے بازو چھوڑنے کے بجائے ان پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔ سیاہ لبادے والی عورت کی نقاب سے جھانکتی سرخ ڈوروں والی خوب صورت آنکھوں سے غضب جھلکنے لگا۔ وہ شاید طیش کے عالم میں خود کو گرفت میں لینے والی خواتین سے کچھ بولی بھی لیکن فاصلہ اتنا تھا کہ ساشا تک اس کی آواز پہنچنا ممکن نہیں تھا۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ اس طرف دیکھنے سے گریز کرو۔'' سلیمان نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ کی گرفت میں لے کر سختی سے دباتے ہوئے سرگوشی کی تو اسے اپنی نظروں کا رخ بدلنا پڑا۔ اب وہ باقی تماشائیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ اعلان کے بعد شاید ان میں سے چند واپس چلے گئے ہوں لیکن وہاں لوگوں کی اتنی بڑی تعداد موجود تھی کہ چند

UUNOVELS.COM

افراد کی کمی کو محسوس نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''امیر محترم کو یقیناً یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہوگی کہ ان کے عوام کی اکثریت بہادر اور باہمت ہے۔'' لوگوں کی بڑی تعداد کو وہیں جمے بیٹھے دیکھ کر نقیب نے تبصرہ کیا جس کی داد تالیاں بجا کر دی گئی۔ ساشا نے کن انکھیوں سے خواتین کے حصے کی طرف دیکھا۔ اسے سیاہ لباس والی وہاں بیٹھی دکھائی دے گئی لیکن وہ مضطرب سی تھی اور اس کے انداز سے بے بسی صاف جھلک رہی تھی۔

نقارے بجنے کی آواز نے ساشا کی توجہ اس کی طرف سے ہٹا لی اور وہ قفس سے لوہے کے جنگلے کا حصہ ہی معلوم ہوتے اس آہنی دروازے کے کھلنے کا منظر دیکھنے لگا جس کے دونوں پٹوں کو بیک وقت دو افراد دھکیل کر کھول رہے تھے۔ جنگلے کے اس حصے کے سامنے تماشائیوں کی نشستیں نہیں تھیں بلکہ نیم دائرے کے دونوں سروں کے درمیان موجود وہ راستہ تھا جسے تماشا گاہ میں آمد و رفت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ آہنی دروازوں کے کھلتے ہی اس راستے سے دو قوی ہیکل ہاتھی داخل ہوتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ اپنے نگرانوں کے ساتھ بڑے اطمینان سے سج سج چلتے جنگلے کے کھلے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ دروازے سے گزر گئے اور ان کے نگران باہر ہی رک گئے۔ دروازہ کھولنے والے دونوں افراد جو اپنی اپنی جگہ بدستور موجود تھے، پھرتی سے حرکت میں آئے اور آہنی دروازے کے دونوں پٹ تیزی سے بند کر دیے۔ ان کے اس عمل سے بے نیاز دونوں ہاتھی اپنی سونڈیں اٹھائے جنگلے کے اندر ست روی سے چہل قدمی کرنے لگے۔

''صاحبان — قدردان! آج آپ ایک ایسا مقابلہ دیکھنے جا رہے ہیں جسے کسی ایک فریق کی موت تک جاری رکھا جائے گا۔ اس سنسنی خیز مقابلے کے لیے منتخب کیے جانے والے دونوں فریقین کے درمیان طاقت کے توازن پر آپ میں سے کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے۔'' اعلان کرنے والا اعلان کر رہا تھا اور ساشا سمیت تمام حاضرین کی نظریں جنگلے کے اندر چہل قدمی کرتے دونوں ہاتھیوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ واقعی دونوں ہاتھی ایک دوسرے کی ٹکر کے تھے اور کسی ایک کو دوسرے سے کم تر قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

''آپ سب جانتے ہیں کہ انسان کو عقل میں دیگر تمام مخلوقات پر برتری حاصل ہے۔ انسان کی عقل اور عزم و حوصلہ یکجا ہو جائیں تو وہ بڑے سے بڑے وحشی جانور کو زیر کر سکتا ہے۔'' وہاں موجود لوگوں کی توجہ اعلان کرنے والے کے الفاظ سے زیادہ ہاتھیوں کی جوڑی کی طرف تھی پھر بھی وہ بغیر رکے اپنی تقریر جاری رکھے ہوئے تھا۔

''آج ان طاقتور ہاتھیوں سے جن دو انسانوں کا مقابلہ ہونے جا رہا ہے، ان میں سے ایک کی طاقت اور قوت کا یہ عالم ہے کہ اس کے سامنے بڑے بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے جبکہ دوسرا شخص اتنا کائیاں ہے کہ بہترین حفاظتی انتظامات اس کے علم کے سامنے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔'' اس شخص کے الفاظ نے ہر ایک کو چونکا دیا۔ وہ جو اب تک یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کے سامنے ان دو ہاتھیوں کا مقابلہ ہونے جا رہا ہے، یہ جان کر ششدر رہ گئے تھے کہ ان دیوہیکل ہاتھیوں کو انسانوں سے لڑوایا جانے والا ہے۔ پھر انہوں نے ہاتھیوں کے مقابلے میں لائے جانے والے ان دو افراد کو دیکھ لیا۔ وہ بھی اسی راستے سے لائے جا رہے تھے جس راستے سے ہاتھیوں کو لایا گیا تھا لیکن ان میں اور ہاتھیوں میں یہ فرق تھا کہ وہ ہاتھیوں کی سی آزادی سے نہیں لائے جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور سر سے گردن تک سیاہ غلاف منڈھے ہوئے تھے جن کی وجہ سے نہ تو وہ کسی کو دیکھ سکتے تھے اور نہ ہی انہیں دیکھنے والے انہیں شناخت کر سکتے تھے۔ ان کے جسموں پر لباس کے نام پر فقط لنگوٹیں کسی ہوئی تھیں اور عریاں جسموں پر نظر آنے والی سرخ لکیریں گواہی دے رہی تھیں کہ انہیں بہت بے دردی سے پیٹا گیا ہے۔ ایک شخص کی پیٹھ اور کلائیوں پر جلنے کے نشانات بھی تھے۔

انہیں توجہ سے دیکھتے ساشا نے فوراً ہی ان کے بارے میں نتیجہ اخذ کر لیا۔ چوڑے جسم کے مالک شخص کی جلد کی سیاہ رنگت اور اس کے ساتھی کی صاف رنگت نے اسے گواہی دی کہ ان میں سے ایک قید خانے کا حبشی نگراں اور دوسرا دل میں امیر زادی کی تمنا رکھنے والا مفرور قیدی لوئیس ہے۔ جنگلے کے دروازے پر لا کر ان دونوں کے ہاتھ آزاد کر دیے گئے اور پھر ان کے سر اور منہ پر منڈھے غلاف اتار کر دروازہ کھول کر انہیں اندر دھکیل دیا گیا۔ دھکا اتنا شدید تھا کہ وہ دونوں زمین پر جا گرے۔ ان کے سنبھل کر کھڑے ہونے تک ان کی طرف دو تلواریں اڑتی ہوئی آ کر ان کے قدموں میں ڈھیر ہو چکی تھیں۔

''یہ دونوں افراد امیر محترم کے معتوب ہیں۔ امیر محترم چاہتے تو انہیں قید خانے میں ہی شدید اذیتوں سے

گزار کر ان کی غداری کی سزا دے سکتے تھے لیکن اس مقابلے کی صورت میں ان نمک حرام غداروں کے لیے تھوڑی سی رعایت رکھی گئی ہے۔ اگر یہ دو چالاک اور زورآور لوگ ان دونوں ہاتھیوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے تو انہیں ان کا جرم معاف کر کے رہائی دے دی جائے گی۔"

اعلان کرنے والا ایک بار پھر حاضرین کی معلومات میں اضافہ کر رہا تھا۔ اس اعلان پر تماشائیوں کے اندر عجیب جوش و خروش پیدا ہو گیا تھا اور وہ نعرے بازی کر کے اپنے جذبات کا اظہار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دونوں ہاتھی جو حبشی اور لوئیس کے جنگلے کے اندر دھکیلنے کے باوجود ابھی تک بے نیازی سے چہل قدمی کر رہے تھے، اس شور و غل کے باعث مزید بے نیازی کا مظاہرہ نہیں کر سکے اور کان کھڑے کرتے اور سونڈیں لہراتے ہوئے گویا صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ صورت حال کو حبشی اور لوئیس نے بھی سمجھ لیا تھا۔ ان کے پاس جان بچانے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ وہ ان قوی ہیکل ہاتھیوں کو پچھاڑ دیتے۔ ہاتھیوں کے ہوشیار ہو کر خود پر حملہ آور ہونے سے قبل ہی انہوں نے خود حملے میں پہل کا فیصلہ کیا اور اپنے قدموں میں گری ایک ایک تلوار اٹھالی۔ تلواریں اٹھا کر وہ ہاتھیوں کی طرف لپکے اور دونوں نے بیک وقت ایک ایک ہاتھی پر حملہ کر ڈالا۔ لوئیس کا نشانہ اپنے حصے میں آنے والے ہاتھی کی سونڈ تھی جبکہ حبشی نے دوسرے ہاتھی کی آنکھ کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی۔

دیکھنے والی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ دونوں کے وار اتنے تیز اور قوت والے تھے کہ اصولاً لوئیس کے مقابل ہاتھی کی سونڈ کٹ کر دور جا گرنی چاہیے تھی اور حبشی کی تلوار کو ہاتھی کی آنکھ سے گزر کر اس کے دماغ تک رسائی حاصل کر لینی چاہیے تھی لیکن اگلا لمحہ ان دونوں کے ساتھ ساتھ تماشائیوں کو بھی چونکا دینے والا تھا۔ جس ہاتھی کی سونڈ کو نشانہ بنایا گیا تھا، اس کی سونڈ کٹ کر دور جا گرنے کے بجائے بس اتنی زخمی ہوئی تھی کہ اس کا تھوڑا سا خون نکل آیا جبکہ حبشی کی تلوار کا نشانہ بننے والے ہاتھی کی بھی آنکھ تو بے شک زخمی ہو گئی لیکن تلوار نے وہاں تک رسائی حاصل نہیں کی جہاں تک حبشی اسے پہنچانا چاہتا تھا۔

"دونوں قیدیوں کو کند تلواریں دی گئی ہیں۔" صورت حال دیکھ کر ساشا بے اختیار بڑبڑایا۔

"اس مقابلے کی حیثیت بس شغل کی سی ہے ورنہ اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ امیر محترم اپنے مجرموں کو معاف کر دیں۔" اس کے پہلو میں بیٹھے سلیمان نے سرگوشی میں تبصرہ کیا۔ ادھر دونوں قیدی بھی یقیناً صورت حال سمجھ کر اس دھوکے بازی پر احتجاج کرنے کا ارادہ کر رہے تھے لیکن بپھر جانے والے ہاتھیوں نے انہیں اس کا موقع بھی نہیں دیا۔ ہاتھیوں کے بپھرنے میں جہاں ان کے اوچھے واروں کا کردار تھا، وہیں جنگلے کے باہر کھڑے کچھ افراد بھی انہیں غضب ناک کرنے کا اہتمام کر رہے تھے۔ ان افراد نے اپنے ہاتھوں میں لمبے لمبے بانس اٹھا رکھے تھے۔ ان بانسوں کے سروں پر تیز برچھیاں سی منسلک تھیں۔ جنگلوں کی سلاخوں کے درمیان سے بانس اندر لے جا کر وہ لوگ تیز برچھی نما آلات سے ہاتھیوں کو کچوکے لگا رہے تھے۔ بے در پے لگائے جانے والے ان زخموں نے ہاتھیوں کو سخت مشتعل کر دیا تھا۔ سونڈیں اٹھا اٹھا کر چنگھاڑتے ایک طرف وہ تماش بینوں کے جوش و خروش اور ہیجان میں اضافہ کر رہے تھے تو دوسری طرف حبشی اور لوئیس کا دہشت سے برا حال تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں موجود کند تلواریں پھینک کر رحم کی درخواست کرنے کے لیے امیر کے قدموں میں لیٹ جانا چاہتے تھے لیکن غیظ میں آنے والے ہاتھیوں نے انہیں اس کا موقع بھی نہیں دیا۔ وہ زمین کا سینہ کوٹتے اور دیکھنے والوں کا دل دہلاتے حبشی اور لوئیس کی طرف بڑھے۔ حبشی نے ہوشیاری سے کام لے کر ایک طرف جست لگاتے ہوئے خود کو حملے سے محفوظ رکھا لیکن لوئیس کو اتنی بھی مہلت نہیں ملی اور ہاتھی نے اسے اپنی سونڈ میں جکڑ کر اوپر کی طرف اٹھایا۔

سوئے اتفاق لوئیس کا تلوار والا ہاتھ آزاد تھا۔ اس نے اپنے حواس مجتمع کیے اور ہاتھ گھما کر تلوار کی نوک ہاتھی کی دائیں آنکھ میں داخل کرنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا لیکن تکلیف سے بلبلا اٹھنے والے ہاتھی نے طیش کے عالم میں اسے جنگلے سے دے مارا۔ شدید شور کے باوجود اس کی چیخ نے ساشا کے کانوں تک رسائی حاصل کر لی۔ پتا نہیں کیوں اس نے بے ساختہ ہی خواتین والے حصے کی طرف دیکھا۔ وہاں ایک عجیب منظر اس کا منتظر تھا۔ سیاہ لبادے والی عورت کے اضطراب سے ظاہر تھا کہ وہ اس جگہ سے اٹھ جانا چاہتی ہے لیکن اس کے دائیں بائیں بیٹھی عورتوں نے اس کے دونوں بازو تھام رکھے تھے اور ایک عورت پشت پر کھڑی یوں اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی جیسے انہیں دبا رہی ہو لیکن حقیقتاً اس کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت سیاہ لبادے والی عورت کو یوں کرسی کی طرف

دھکیل رہی تھی کہ وہ چاہنے کے باوجود وہاں سے اٹھنے میں ناکام تھی۔

ساشا کی تیز نظروں نے اس کی آنکھوں میں موجود آنسو بھی دیکھ لیے لیکن اگلے ہی پل وہ شور شرابے کے باعث جنگلے کے اندر جاری موت کے کھیل کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔ حبشی جو مسلسل حرکت کرتا اپنے مقابل موجود ہاتھی کو جل دینے میں کامیاب جا رہا تھا، ہاتھی کی دوسری آنکھ کو بھی نشانہ بنانے کی خواہش میں اس سے قریب ہوا اور جانے کیسے اپنا توازن کھو بیٹھا۔ اس کے گرتے ہی ہاتھی کا بھاری بھرکم پاؤں اس کے سینے پر پڑا اور حبشی کی دلدوز چیخ نے تماشا دیکھنے والوں کے دلوں کو لرزا دیا۔ یقینی طور پر اس کی کئی پسلیاں ایک ساتھ ٹوٹ چکی تھیں لیکن کینہ پرور مشتعل جانور اسے معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ اپنے اگلے دونوں پیر بار بار اٹھا کر حبشی کے سینے اور چہرے کو روندنے میں لگا ہوا تھا۔ مضبوط جسامت کا طویل قامت حبشی جس کے سامنے قید خانے کے قیدی کھڑے ہو کر تھر تھر کانپتے تھے اور وہ بڑی بے رحمی سے ان کے لیے سزائیں اور اذیتیں تجویز کرتا تھا، حقیر چوہے کی طرح ایک جانور کے پیروں تلے کچلا جا رہا تھا۔ اس کے جسم کی تڑپ اور پھڑک سے ظاہر تھا کہ روح جسم کا پنجرہ چھوڑ کر پرواز کرنے کو ہے۔ عین اسی لمحے جبکہ حبشی اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا، لوئیس زندگی کی جنگ جاری رکھے ہوئے تھا۔ وہ کسی ترکیب سے لوہے کے اونچے جنگلے پر اتنی بلندی تک چڑھ گیا تھا کہ اس کے لیے جنگلے سے باہر کودنا ناممکن نہیں رہا تھا لیکن بانسوں سے لیس وہ افراد جو اب تک ہاتھیوں کو مشتعل کرنے کا کام کرتے رہے تھے، اب اس کے درپے ہو گئے تھے اور اسے کچوکے لگاتے اس بات کا بالکل موقع نہیں دے رہے تھے کہ وہ جنگلے سے باہر کود سکے۔ اپنی اس کوشش میں ناکام ہو کر اس نے عجیب ہی حرکت کی اور جنگلے پر سے چھلانگ لگا کر اپنے مقابل ہاتھی کی پشت پر سوار ہو گیا۔ اس کی اس حرکت پر ہاتھی نے زور سے چنگھاڑ کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اسے اپنے اوپر سے جھٹکنے کی کوشش کی۔ لوئیس نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے دائیں بائیں بانہیں پھیلا کر اس کے دونوں کانوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کی اس حرکت پر ہاتھی اتنی شدت سے غضبناک ہوا کہ اس کی چنگھاڑ نے لوگوں کے دل دہلا دیے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دیوانگی کے عالم میں بھاگتا ہوا جنگلے تک دوڑتا ہوا گیا اور اتنی قوت سے جنگلے سے ٹکرایا کہ لوئیس کے لیے خود کو اس کی پشت پر قائم رکھنا ممکن نہیں رہا۔ وہ دھپ سے نیچے گرا۔ گرنے سے یقینی طور پر اسے چوٹ آئی تھی لیکن ابھی اس کے اندر سے بقا کی جنگ لڑنے کی خواہش ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس خواہش کو قائم رکھنے میں ان دو آنسوؤں بھری آنکھوں کا بڑا اہم کردار تھا جو جنگلے کے اسی حصے کے سامنے سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ آنکھیں جس جسم کا حصہ تھیں، وہ جسم وقت کے ان لمحات میں سانس لینا بھی بھول چکا تھا۔ بس دو آنسو بھری آنکھیں تھیں جو کسی بھی طرح لوئیس کو اس مشکل سے نکل کر زندہ دیکھنا چاہتی تھیں لیکن انسان کی ہر خواہش ہمیشہ کب پوری ہوتی ہے۔ ان آنکھوں کی خواہش بھی ہار گئی۔

لوئیس جو نیچے گر کر دوبارہ اٹھنے کے بعد بہت پہلے ہی اپنے ہاتھوں سے نکل جانے والی تلوار کے حصول کے لیے حرکت میں آیا تھا، اپنے مقابل ہاتھی سے تو بچ نکلا لیکن وہ حبشی کا بھرکس بنانے میں مصروف ہاتھی کو فراموش کر چکا تھا۔ غیظ سے بھرا وہ ہاتھی حبشی کی لاش کو گوشت اور ہڈیوں کے ملغوبے میں تبدیل کر کے پلٹا تو سیدھا لوئیس کی طرف لپکا۔ ابھی لوئیس اپنی گری ہوئی کند تلوار اٹھا نہیں سکا تھا کہ ہاتھی نے اپنی سونڈ کو حرکت دی، لوئیس کا جسم اس کی سونڈ کی گرفت میں آیا۔ اوپر اٹھا اور پھر دور جا گرا۔ ابھی لوئیس کی چیخ کی گونج برقرار تھی کہ دوسرے ہاتھی نے حرکت کی۔ لوئیس کا جسم ایک بار پھر سونڈ کی گرفت میں آیا۔ فضا میں بلند ہوا اور پھر زمین پر پٹخ دیا گیا۔ اب وہاں ایک عجیب تماشا جاری تھا۔ غیظ، غضب اور انتقام سے بھرے دونوں ہاتھی کسی گیند کی طرح لوئیس کے جسم سے کھیل رہے تھے۔ اس کھیل میں لوئیس کی ہڈیاں ٹوٹنے کے دوران کب اس کی روح نے اس کے جسم کو چھوڑا تھا... چیخے چلاتے، سسکیاں لیتے، صدمے سے گنگ، خونی کھیل سے لطف اندوز ہو کر سسکاریاں لیتے، ہر طرح کے تماشائیوں میں سے کسی ایک کو بھی نہیں پتا چلا تھا کہ کب ایسا ہوا لیکن ان دو آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے وہ لمحہ پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ اس لمحے کے گزرنے پر بھی وہ آنکھیں کھلی رہتیں، یہ کس طرح ممکن تھا۔ آنکھیں بند ہوئیں اور سیاہ لبادے والی خود کو گرفت میں لیے ہوئے ہاتھوں میں جھول گئی۔

سلیمان کے پہلو میں بیٹھے ساشا نے اس منظر کو دیکھا۔ اب اسے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ سیاہ لبادے والی نقاب پوش حسینہ کون تھی؟

(جاری ہے)

UUNOVELS.COM

میک اپ سے بھرے چہرے لیے، بھڑکیلے لباسوں میں ملبوس اجسام بے ہنگم انداز میں ناچ رہے تھے۔ سُر تال کے سنگم سے بے نیاز کئی آوازیں مل کر ساتھ ساتھ بے ڈھنگے انداز میں گا بھی رہی تھیں۔ گانے کی تیز آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرا کر اس کی سماعتوں کو چیرتی جا رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر ہاتھ کانوں پر رکھنے چاہے مگر ہاتھ جیسے مفلوج ہو کر رہ گئے تھے۔ آوازیں لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

جلتے الاؤ پر ٹھنڈی پھوار بن کر برس جانے والے ایک کمزور بادل کا قصہ

UUNOVELS.COM

یوں تو ہر انسان اپنی ذات میں کسی نہ کسی حوالے سے ادھورے پن کا شکار ہوتا ہے مگر... جسمانی نقص نہ صرف اس انسان کو جیتے جی مار دیتا ہے بلکہ قریبی رشتوں سے بھی ہمت اور حوصلہ چھین لیتا ہے... وہ ایک نامکمل انسان تھا مگر... انسان تو تھا... اور افسوس اس کے ادھورے پن نے اس سے انسان ہونے کا حق بھی چھین لیا... پوری دنیا اس کے لیے گرم ریت کا صحرا بن گئی تھی۔ فقط ماں کی ٹھنڈی چھاؤں نے اسے جینے کا حوصلہ دیا لیکن کب تک... بالآخر ایک شام یہ چراغ بھی بجھ گیا...

پناہ گاہ

غزالہ یاسمین

اس سے پہلے کہ اس کے اعصاب جواب دے جاتے یا وہ اپنے حواس کھو دیتی گانے کی آوازیں کچھ مدھم ہونے لگیں مگر اس کے ساتھ ہی پس منظر سے تالیاں پیٹنے کی آواز ابھرنے لگی۔

اور پھر تالیاں پیٹتے کئی ہاتھ اس کی جانب بڑھنے لگے۔

یکدم اسے احساس ہوا کہ کچھ غلط ہونے والا ہے۔ جو اس کے پاس ہے، وہ ان کی تحویل میں جانے دینے سے بچانا ہے۔

اس نے ہاتھ میں پکڑی چیز کو چھپانے کی کوشش کی جیسے ان سب کی نظروں سے بچانا چاہتی ہو مگر آنے والوں کی نظریں اسی شے پر گڑی تھیں۔ کپڑے میں لپٹی اس شے کو اس نے اور بھی سختی سے دبوچ لیا۔

اور پھر ان ہاتھوں نے آگے بڑھ کر اس سے وہ چھین لیا جو وہ ہرگز انہیں نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس نے ان ہاتھوں کو جھٹکنا چاہا مگر وجود بے جان کھڑا رہا۔ اس نے پوری طاقت لگا کر چیخنا چاہا مگر آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ ان چہروں نے ایک آخری نفرت بھری نظر اس پر ڈالی اور اس سے دور ہٹ گئے۔ اس سے چھینی گئی شے اب ان کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ چاہ کر بھی نہ احتجاج کر پائی تھی، نہ ان ہاتھوں سے اپنی چیز کو چھیننے کی ہمت سمیٹ پائی۔

اس نے ایک تیز چیخ ماری اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ تنفس تیز تر تھا جیسے کئی گھنٹوں سے دوڑتی آ رہی ہو۔ اس نے گھبرا کر اپنے پہلو میں دیکھا اور ایک طویل سانس لی۔ ''تو یہ ایک خواب تھا۔'' اس نے خود کلامی کی اور اگر یہ خواب سچ ہو گیا تو.... اندیشے سر اٹھانے لگے۔ ''نہیں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ کبھی بھی نہیں۔''

''تم کر کیا سکتی ہو؟'' اندر جیسے کوئی ہنسا۔

واقعی وہ کیا کر سکتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اب کچھ نہیں تھا۔ جو تھا، وہ اس نے خود گنوا دیا تھا۔ اب وہ تہی داماں تھی۔

☆☆☆

آفس نہایت خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ لکڑی کے خوبصورت کاؤنٹر کے پیچھے بیٹھی نک سک سی تیار جدید لباس پہنے ریسپشنسٹ کھڑی تھی جو مگن انداز میں ایک ہاتھ فون کی طرف بڑھاتی تو دوسرے ہاتھ سے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتی ہوئی نظریں کمپیوٹر اسکرین کی طرف مرکوز کر لیتی۔

ریسپشن سے ذرا ہٹ کر دائیں طرف جدید اسٹائل کا ایل شیپ صوفہ رکھا تھا جو آنے والوں کو وہاں آرام دہ انتظار فراہم کر رہا تھا۔ بائیں طرف کی دیوار مختلف تصاویر سے مزین تھی۔

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور نظریں دوسری طرف گھمائیں۔ صوفے کی دوسری جانب ایک چھوٹا سا فریج تھا جس میں رکھا پانی اور کئی طرح کے مشروبات اس کے گلاس ڈور سے نمایاں تھے۔ اسے یہاں بیٹھنے کا کہتے ہوئے آفس بوائے نے اس فریج سے استفادہ کرنے کا بھی کہہ دیا تھا مگر وہ اب اٹھنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

وہ یہاں انٹرویو کے لیے آیا تھا۔ وہ انٹرویو بھی فارمیلٹی ہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی سلیکشن ہو چکی ہے۔ اسے یہاں بھیجنے والے نے اپنا کارڈ تھماتے ہوئے جن ستائش بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا، وہ اسے یقین دلانے کے لیے کافی تھیں کہ اس کا ''انتخاب'' ہو چکا ہے۔ اب بس رسمی کارروائی کی غرض سے اسے بلایا گیا تھا۔

بالآخر ریسپشنسٹ..... کا فون ختم ہوا اور اس نے اسے آواز دی۔

''آپ آ جائیں پلیز۔''

وہ چپ چاپ اٹھ کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ لڑکی نے ایک فارم نکالا اور اس پر کچھ لکھنے لگی۔ وہ سر جھکائے جوتے کی نوک سے کسی نادیدہ نشان کو کھرچنے کی کوشش کرنے لگا۔

''آپ کا نام؟'' اس کی آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

''احمد..... احمد حسن۔'' وہ جیسے کچھ سوچ کر بولا۔

لڑکی دیگر معلومات لے کر فارم پر اتارنے لگی۔ عمر، قد، رنگت، جنس اور ایسے دیگر بہت سے سوالات جو سراسر نجی نوعیت کے تھے۔ چند سوالوں پر اسے باقاعدہ پسینا آیا۔ اس نے کاغذ اپنی طرف سرکا کر خود لکھنا شروع کر دیا۔ لڑکی نے ہلکی مسکراہٹ سے اسے دیکھا اور کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس نے فارم پُر کر کے خاموشی سے اس کے سامنے کر دیا۔ لڑکی پروفیشنل انداز میں مسکراہٹ چہرے سے چپکائے فارم پر درج مندرجات کمپیوٹر پر منتقل کرنے لگی۔ تمام انٹریز سے فارغ ہو کر اس نے آفس بوائے کو آواز دے کر بلایا۔

''ظفر! انہیں اسٹوڈیو میں لے جاؤ۔''

اور اس کے ہاتھ میں پُر کیا فارم تھما دیا۔ وہ لڑکی سے نظریں چراتا ہوا آفس بوائے کے ساتھ چل پڑا۔

''پتا نہیں کیا سوچ رہی ہو گی میرے بارے میں۔''

پچھلے پانچ منٹ میں دس بار یہ خیال اس کے دماغ میں آیا اور ہر بار اس کی شرمندگی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔ حالانکہ لڑکی کے لیے وہ ایک معمول کی کارروائی تھی۔ روز

UUNOVELS.COM

ایسے کتنے ہی لوگوں کو وہ ڈیل کرتی تھی۔ وہ سر جھٹک کر دوبارہ اپنے کام میں مگن ہو چکی تھی۔

مگر یہ سب اس کے لیے معمول کا کام نہیں تھا۔ انہی سوچوں میں مگن وہ اسٹوڈیو کے دروازے تک آ گیا۔

آفس بوائے نے دروازہ کھولا اور اسے اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی اندر چلا گیا۔ اندر ایک میز پر کئی فائلیں اور فولڈرز پھیلائے ایک شخص کام میں مگن تھا۔ ان کی آمد پر اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور سامنے کھلی فائل تھوڑی سی دائیں جانب سرکا دی۔

"سر جی! ان کو میڈم نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔" آفس بوائے نے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اس شخص کو اطلاع دی۔

کرسی پر بیٹھا شخص اسے گہری نظروں سے گھورنے لگا جیسے کچھ کھوجنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی نظروں نے اوپر سے نیچے تک اس کا بغور جائزہ لیا۔ اسے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ ایک بار پھر اس نے خشک لبوں کو تر کرنے کے لیے زبان ہونٹوں پر پھیری۔ اس کی اضطراری کیفیت اس کے ہر انداز سے نمایاں تھی۔ یقیناً سامنے بیٹھا شخص بھی یہ سب بخوبی نوٹ کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" اس نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے آفس بوائے کو باہر جانے کا کہا۔ وہ خاموشی سے کرسی سرکا کر بیٹھ گیا اور فارم اس کی طرف بڑھا دیا۔

اس شخص نے فارم پکڑا اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔

"اچھا، رانا صاحب نے بھیجا ہے آپ کو؟" کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"جی ——" وہ یک لفظی جواب ہی دے پایا۔

"رانا صاحب کی چوائس بھی خوب ہے۔" وہ شخص ہلکا سا ہنسا۔

"پہلے کبھی یہ کام کیا ہے؟" اس شخص نے پھر اسے نظروں میں تولتے ہوئے پوچھا۔

"ایسے کسی ادارے کے ساتھ نہیں کیا۔ ویسے کیا ہے۔" اس نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

"ہوں —— ہمارے ہاں یہ کام بہت پروفیشنل طریقے سے ہوتا ہے۔ آپ کو اپنے آپ کو اسی انداز میں تربیت دینی ہوگی۔ ہمارے پاس اس کام کے لیے ٹرینر موجود ہیں جو آپ کو مکمل گائڈ کر دیں گے۔ مگر اس سے پہلے آپ کا پورٹ فولیو بنے گا۔"

سامنے بیٹھا شخص اسے ادارے کے قوائد و ضوابط اور طریقہ کار سے آگاہ کر رہا تھا اور وہ سر جھکائے بس سن رہا تھا۔

"پہلے کوئی پورٹ فولیو بنا ہوا ہے آپ کا؟" اس نے پوچھا تو اس نے بغیر کچھ بولے بس گردن نفی میں ہلا دی۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ یہ کام ابھی ہو جائے گا۔"

اب وہ اسے سمجھانے لگا کہ کن کن زاویوں سے اس کی تصاویر لی جائیں گی اور اسے کس طرح سے کیمرے کو دیکھنا ہے۔ کیسے تاثرات دینے ہیں اور کس طرح سے پوز کرنا ہے۔

وہ اب بھی خاموش بیٹھا تھا۔ تاہم فوٹو گرافر کے الفاظ پر اس کے کان پوری طرح الرٹ تھے۔

"سب سمجھ گئے؟"

اس نے بغیر کچھ بولے سر ہلا دیا۔ سمجھ تو وہ گیا تھا مگر کیا یہ اس سے ہو پائے گا؟ اس کا جواب اس کے پاس بھی نہیں تھا۔

"چلو پھر اب شروع کریں۔"

اس نے خود کو کیمرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار کیا۔ سب کچھ ذہن سے نکال کر —— کیونکہ اسے اب یہ کرنا ہی تھا۔

اب وہ بتائے گئے طریقے کو ذہن میں لا کر ویسے ہی پوز بنانے لگا۔ فوٹو گرافر نے کئی تصاویر لیں مگر اس کے چہرے کے تاثرات یہ بتانے کے لیے کافی تھے کہ وہ ان سے مطمئن نہیں ہے۔ اس نے اسے دوبارہ سے سمجھایا اور پھر کیمرے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ارے اس طرح نہیں۔ ایسے پوز کرو۔"

کچھ دیر بعد جب پھر وہ مطلوبہ شاٹس نہیں دے پایا تو فوٹو گرافر نے جھلا کر کہا اور دوبارہ اسے کر کے سمجھایا۔ سمجھ تو وہ پہلی بار میں ہی گیا تھا مگر جو کہا گیا تھا وہ —— وہ نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب مشکل ہوگا مگر اتنا مشکل ہوگا اس کا اندازہ نہیں تھا۔

اس کا جسم پسینے سے شرابور ہونے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ یہ سب چھوڑ کر بھاگ جائے مگر کیا بھاگنے سے وہ بچ سکے گا؟ سوال اندر کلبلانے لگا۔

زندگی آپ کو ہمیشہ دو چوائس دیتی ہے مگر دوسری چوائس پہلی کا متبادل ہو یہ ضروری نہیں۔ وہ جان چکا تھا کہ وہ دیے گئے دونوں راستوں میں سے کسی کا بھی انتخاب کرے، اس کی منزل ایک ہی ہے۔

☆☆☆

وہ چادر سنبھالتی ہوئی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اس کے ننگے پیر سیڑھیوں کی خنکی ہٹ کو واضح طور پر محسوس کر سکتے تھے۔ ماربل کی سیڑھیاں جن کے کنارے کئی جگہ سے تڑخے ہوئے تھے۔ جن پر گزرنے والے اپنے

نشان ثبت کر رہے تھے۔

نادیدہ مگر نہ مٹنے والے پختہ نشانات..... جنہیں وہ سیڑھیوں پر نظریں گاڑے کھوجنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے آس پاس کتنے ہی پیر تیزی سے آجا رہے تھے جن کا میل سیڑھیوں کو اور بھی میلا لبنا رہا تھا۔

ایک ایک سیڑھی کو بغور دیکھتی وہ اوپر آ گئی۔ سامنے لوگوں کا جم غفیر تھا۔

ہر شکل، جسامت کے لوگ۔ امیر غریب، جوان بوڑھے۔ اپنی اپنی خواہشات کا انبار اٹھائے لوگ جھولیاں پھیلائے کھڑے تھے۔ کسی کو اولاد چاہیے تھی تو کوئی اولاد کے دیے دکھ پر مرہم لینے آیا تھا۔ کسی کو دولت کی طلب تھی تو کوئی دولت دے کر سکھ لینے آیا تھا۔ غرض جتنے لوگ تھے اتنی ہی ضرورتیں۔

ضرورت تو اسے بھی یہاں کھینچ لائی تھی مگر وہ کچھ مانگنے نہیں دینے آئی تھی۔

کتنی عجیب بات ہے نا ہم رب سے مانگتے ہیں اور بے تحاشا مانگتے ہیں اور پھر اس کی دین کو اپنی خواہش کے ترازو میں تول کر دیکھتے ہیں۔ دین کا پلڑا کبھی خواہش کے آگے جھک جاتا ہے کبھی خواہش کو جھکا دیتا ہے اور جب ملی ہوئی چیز خواہش کو پورا نہ کر پائے تو ہم اسے واپس کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اسے بھی رب نے وہ دیا تھا جس کی اسے کبھی خواہش نہیں تھی۔ اسے کیا کسی کو بھی اس کی خواہش نہیں تھی۔ وہ دین نہیں ''عذاب'' تھا جو کسی کردہ گناہ کے بدلے میں اسے ملا تھا۔ خواہش نہ ہوتے ہوئے بھی اس دین نے اسے جکڑا ہوا تھا۔ اس کے لمس نے اس کی خواہش کو کب کا مفلوج کر دیا تھا مگر اب خواہش اور اختیار اس کے ہاتھ میں ہی کب رہا تھا۔ اب وہ چاہ کر بھی وہ دی گئی چیز نہیں رکھ سکتی تھی۔ اسے اس کو لوٹانا ہی تھا اور اب وہ وہی لوٹانے آئی تھی۔

یہاں آنے سے پہلے اس نے بہت سوچا کہ کہاں کہاں جائے۔ اس کے پاس کئی آپشنز تھے مگر وہ چاہ کر بھی ان میں سے کسی کو اپنا نہیں سکی۔ پھر پتا نہیں کیسے اس کے قدم اس دربار کی طرف اٹھ گئے۔ اس نے سنا تھا کہ یہاں خدا کے پیارے ہوتے ہیں۔ جن کی عرضی خدا کبھی رد نہیں کرتا۔ اسے بھی یہاں سے ایسی ہی سفارش درکار تھی۔

اِدھر اُدھر دیکھتی وہ اندر کی جانب بڑھ گئی۔ باہر کی نسبت اندر لوگوں کا ہجوم اور بھی زیادہ تھا۔ کہیں پر لوگ نوافل ادا کر رہے تھے اور کہیں جالیوں سے سر ٹکائے زار زار رو رہے تھے۔ کہیں کہیں ایک دم سے لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہوتا اور تھوڑی دیر میں چھٹ جاتا۔ وہ لنگر بٹنے کا عمومی منظر تھا۔

اسے بھی بھوک کا احساس ہوا۔ وہ صبح ناشتا کیے بغیر گھر سے نکلی تھی اور اب سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ انسان کیسی ہی تکلیف میں کیوں نہ ہو، بھوک کبھی نہیں مرتی۔ اس کی بھی بھوک زندہ تھی مگر اشتہا مر چکی تھی۔

وہ ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئی اور آتے جاتے لوگوں کو دیکھنے لگی۔ نیاز مانگتی ایک عورت بیٹھے ہوئے لوگوں کے بیچ سے گزرتی ہوئی انہیں پیکٹ پکڑا رہی تھی۔ ایک پیکٹ اس نے اس کی جھولی میں بھی ڈال دیا... جو اس نے بغیر دیکھے سائڈ پر رکھ دیا۔ کافی دیر ایک ہی زاویے سے بیٹھے رہنے کے بعد وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی۔ گزرتے وقت کا احساس ایکدم ہی جاگا۔ وہ جو کام کرنے آئی تھی... اسے جلدی کر کے گھر جانا تھا..... مدثر کے آنے سے پہلے مگر ایک بار پھر اس کی ہمت ٹوٹنے لگی۔ ضبط پھر سے ہارنے لگا۔

کیا کرے اور کیسے؟ کس سمت جائے؟

لوگوں کے اتنے ہجوم میں بھی اسے اپنا آپ تنہا لگ رہا تھا۔

ایک طرف سے قوالی کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ وہ بلا سوچے سمجھے اسی سمت چلنے لگی اور چلتے چلتے وہاں آ گئی جہاں شاید اسے نہیں آنا تھا۔

قوال لہک لہک کر قوالی گا رہا تھا۔ گانے والے کی آواز میں بے حد سوز تھا کہ لوگ بے اختیار جھومنے لگتے۔ کئی لوگ باقاعدہ رقص کر رہے تھے اور انہی میں وہ فقیر بھی تھا۔

لوگوں کے ہجوم سے گزرتی اس کی نظر اس فقیر پر پڑی اور وہیں ٹھہر گئی۔ وہ چاہ کر بھی اپنی پلکیں نہیں جھپکا پائی۔ اتنے بدلے حلیے میں بھی اسے اس کو پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔

پچھلے آٹھ گھنٹے اور چودہ منٹ میں اس نے بہت سے ممکنات سوچے تھے۔ بس جو نہیں سوچا تھا، وہ یہ تھا۔

سابقہ تین ماہ اور اٹھارہ دن میں اس نے ہر روز اس کے بارے میں ہی سوچا تھا مگر وہ اسے یہاں مل جائے گا، یہ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھی جوار گرد سے بے نیاز وجد کی سی کیفیت میں جھوم رہا تھا۔

☆☆☆

الفاظ کیا تھے جیسے سیسہ پگھل کر اتر گیا ہو کانوں میں اور اس نے باقی سب آوازوں کی راہ بند کر دی ہو۔

JUNOVELS.COM

زینب کے وہ الفاظ اس کے کانوں میں گھس کر آنکھوں سے پانی بن کر نکل رہے تھے اور وہ سن بیٹھا رو رہا تھا۔

''نہیں ہے یہ میرا بھائی۔''

''مت کہیں اسے میرا بھائی۔''

اماں اسے چپ کروا رہی تھیں مگر آج وہ بولتی جا رہی تھی۔ سالوں کا زہر زبان اگلنے لگی تھی تو بند اتنی جلدی کیسے بندھ جاتا۔

''اس کی وجہ سے لوگ آتے جاتے چھیڑتے ہیں۔ میری دوستیں میرے پیچھے میرا مذاق اڑاتی ہیں۔ ہنستی ہیں مجھ پر۔''

وہ چلانے لگی۔ اماں کی ڈانٹ ڈپٹ، تسلی، پچکار آج کچھ بھی اس کے غصے اور تیز لہجے کو روکنے سے قاصر تھے۔

اور وہ چپ تھا، بالکل چپ..... کسی مجسمے کی طرح بے جان۔

وہ ساکت بیٹھا بس فرش کی بجری میں کچھ کھوج رہا تھا۔ مگر کان پوری طرح ہر لفظ کو اندر اتار رہے تھے۔

''اس کی وجہ سے کبھی میرا گھر نہیں بسے گا۔ میں بتا رہی ہوں اماں۔ اس نے اپنی نحوست میرے مقدر پر بھی مل دی ہے۔'' اب اس کے چیخنے چلانے میں رونا بھی شامل ہو چکا تھا۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی وہ۔ آج بھی اچھا بھلا رشتہ ہاتھ سے نکلا صرف اس کی وجہ سے۔

سب ٹھیک تھا، انہیں زینب پسند آ گئی تھی۔ اس کی خوبصورتی کے آگے کرائے کا چھوٹا سا مکان بھی ماند پڑ گیا تھا۔ لندن پلٹ انجینئر بیٹے کے لیے وہ گوہر نایاب مل گیا تھا جس کو وہ تین سال سے تلاش رہی تھیں اور شاید ہی پورے شہر میں کوئی بیری بچی ہو جسے وہ چھان پھٹک نہ چکی ہوں۔ رسماً ہاں ہو چکی تھی۔ وہ جلد از جلد شادی کی خواہاں تھیں۔ انہیں نہ جہیز کی خواہش تھی نہ ہی کوئی لالچ۔ بس وہ زینب کو جلد از جلد بہو بنا کر گھر لے جانا چاہتی تھیں۔ سب ٹھیک تھا مگر پھر انہیں اس ''بھائی'' کی خبر ہو گئی تھی۔

اور..... انہوں نے انکار کر دیا۔

زینب جانتی تھی کہ پھر ایسا ہی ہوگا۔ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا تھا۔ اس کے لیے اب یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ مگر ہر بار امید کا دیا جلا کر بیٹھ جاتی۔

مگر کب تک؟ جیسے ہی حقیقت سے پردہ ہٹتا پھر سے اندھیرا ہو جاتا اور یہ اندھیرا تو اب مقدر تھا جو ان کی زندگیوں پر برسوں سے چھایا ہوا تھا۔

اس بار پھر اس نے وہی غلطی کی تھی۔ امید باندھنے کی غلطی۔

مگر ایک ڈر ساتھ ساتھ رہا تھا۔ ان کے آنے سے لے کر رشتے کے لیے ہاں کہنے تک وہ اسی ڈر کو محسوس کرتی رہی تھی مگر کہیں ایک آس تھی جو اس بار کسی معجزے، کسی انہونی کے ہونے کی نوید پر قائم تھی۔

ہوا وہی جو ہونا تھا مگر اس بار اس سے برداشت نہ ہو سکا۔

کب تک برداشت کرتی وہ۔ بتیس سال سے برداشت ہی تو کر رہی تھی اور ہنسی خوشی برداشت کر رہی تھی مگر اب تھک گئی تھی۔

بچپن سے سب سہتی آئی تھی۔ ہمیشہ چپ رہی۔ کبھی ماں کی ماما کے آگے..... کبھی اکلوتے بھائی کے خیال میں۔

کبھی خود اس کی ڈھال بنتی تھی، کبھی اس کے گلے لگ کر ساتھ روتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ تضحیک کے زخم اس نے بھی سہے تھے۔ قطرہ قطرہ، لفظ لفظ اترتا تنفر کہیں نہ کہیں اسے بھی متاثر کرتا رہا تھا۔ مگر وہ پھر بھی ہمیشہ جڑ کر کھڑی رہی۔

مگر زمین زہریلی ہو تو کب تک جڑیں سہارا دیں گی۔ کبھی نہ کبھی تو تنا بھی کھوکھلا ہو کر گرے گا ہی۔

اور آج مرتضیٰ کا وہ سہارا چھن گیا تھا۔ آج زینب نے بھی اس سے منہ موڑ لیا تھا۔

وہ جو اس کی اکلوتی دوست تھی، رازداں تھی..... اس کی غم گسار تھی۔ وہ بھی اس سے روٹھ گئی تھی۔

مرتضیٰ نے کبھی کسی سے امید نہیں رکھی تھی کہ کوئی اس کے درد کو سمجھے، تسلی دے یا مداوا کرے مگر زینب سے اسے امید نہیں مان تھا کہ وہ اس کی تکلیف کو سمجھتی ہے۔ ساری دنیا بھی ساتھ نہ ہو تو بھی وہ اس کے ساتھ ہے اور آج وہ مان ٹوٹ گیا تھا۔

وہ نہ ہوتا تو آج وہ بتیس سال کی عمر میں بھی رشتے کے انتظار میں بڑھتی عمر کے ماہ و سال نہ گن رہی ہوتی۔

مگر اب اپنی وجہ سے وہ اس کی زندگی مزید برباد نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

☆☆☆

ثریا کی سوکھی کوکھ تیرہ سال بعد ہری ہوئی تھی۔ ایک بیٹی کی پیدائش کے بعد نور حسن نے سالوں بیٹے کی خواہش میں دعائیں کرتے دن گزارے مگر قدرت جیسے اس کا صبر آزما رہی تھی اور اب جب کوئی امید نہ بچی تھی تو معجزہ سا ہو گیا۔

کتنی دیر تک وہ بے یقینی سے ثریا کی شکل دیکھتا رہا۔

''تو سچ کہہ رہی ہے نا۔ کہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟''

اور وہ ہنس کر رہ گئی۔

''ڈاکٹر نے غلط رپورٹ تو نہیں دے دی ہے؟'' وہ

UUNOVELS.COM

اب بھی ماننے کو تیار نہ تھا۔

''میرا وارث میری شناخت آنے والا ہے۔'' خوشی اس کے چہرے سے چھلکی جا رہی تھی۔

''بس آج سے تو کوئی کام نہیں کرے گی۔ آرام کر، اپنا اور میرے بیٹے کا خیال رکھ۔'' اس نے اسے لے جا کر کمرے میں بٹھا دیا۔

نور حسن خوش تھا، بے حد خوش..... آنے والے کی آمد کی خبر نے ہی اس کے وجود میں خوشی بھر دی تھی۔ اسے اپنا آپ یکدم جوان اور توانا لگنے لگا..... اس نے پیدائش سے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ بیٹا ہوگا۔

اس نے گھر کے کام کاج سے ثریا کو منع کر دیا اور پہلی فرصت میں جا کر گاؤں سے بڑی بہن کو لے آیا۔

رخسانہ آپا نور حسن سے چار سال بڑی تھیں مگر کم عمری میں شادی کے باعث اب خود بھی اپنے بچوں کی شادیاں کر کے فارغ تھیں۔

زینب ابھی تیرھویں سال میں تھی۔ گو اتنی سمجھدار نہ تھی مگر آنے والے مہمان کی آمد کا اسے بھی پتا تھا۔ بھائی ہوتا یا بہن، اسے اس سے غرض نہیں تھی۔ بس اس کے اکیلے پن کو دور کرنے کوئی آنے والا تھا، اس کے لیے یہی خوشی بہت تھی۔

سارے گھر کا کام رخسانہ آپا پر آ پڑا تھا اور اسے شرمندگی سی ہونے لگتی کہ وہ بس سارا دن آرام کرتی رہتی ہے۔ ایسے میں نور حسن کی نظر بچا کر رخسانہ آپا کی کچھ مدد کرنے کی کوشش کرتی تو نہ جانے کیسے نور حسن کو خبر ہو جاتی اور وہ سر پر پہنچ جاتا۔

''آپا! آپ ہی اسے منع کر دیا کریں۔ پتا ہے نا آپ کو کہ اسے آرام کی کتنی ضرورت ہے۔''

اس کے ساتھ ساتھ رخسانہ آپا کو بھی سننا پڑتی اور آپا بیچاری صفائیاں پیش کرتی رہ جاتیں۔

ثریا نور حسن کی اتنی توجہ اور محبت سے جہاں نہال ہوتی وہیں اس کا بیٹا ہونے کا یقین بھی اسے ڈرانے لگتا۔

''نور حسن کا یقین سلامت رکھنا میرے مالک۔'' ہر نماز کے بعد وہ ہاتھ اٹھا دیتی۔

اور آخر کار وہ دن آ ہی گیا جس کا ان دونوں کو شدت سے انتظار تھا۔

کئی گھنٹوں کے جان لیوا انتظار کے بعد آخر کار نرس نے ایک ننھا وجود لا کر نور حسن کے حوالے کیا۔

''میرے مالک تیرا لاکھ لاکھ شکر!'' نور حسن نے بلند آواز سے رب کا شکر ادا کیا۔ ''میری بیوی ٹھیک ہے نا؟''

اس نے بچے پر نظریں گاڑے پوچھا۔

''ہاں وہ ٹھیک ہے۔'' نرس نے بتایا۔

اور نور حسن کو مزید پوچھنے کی ضرورت نہ تھی کہ لڑکا ہے یا لڑکی۔ چہرے کے نقوش نے ہی بتا دیا کہ اس کا یقین سلامت ہے۔ وہ اپنی خوشی میں مگن اور اپنے یقین پر نازاں تھا۔ نرس کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر چپ چاپ اندر واپس چلی گئی۔

گلابی کمبل میں لپٹا وجود نور حسن کے لیے خدا کی سب سے بڑی دین تھا۔ اس کا سب سے پیارا انعام۔ اس نے اس کے پھولے ہوئے گالوں کو نرمی سے چھوا اور ماتھے پر پیار کیا پھر اس کے کانوں میں اذان دی۔

اس کے بعد اس نے بچہ رخسانہ آپا کی گود میں دے دیا اور انہوں نے بچے کو محبت پاش نظروں سے دیکھا اور انگلی پر ذرا سا شہد لے کر چٹا دیا۔ پھولے گالوں والا بچہ پٹ سے آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگا۔

''ماشاء اللہ بہت پیارا ہے۔ بالکل تجھ پر گیا ہے۔'' رخسانہ آپا نے اس کی بلائیں لیں۔

اس نے ثریا سے بہت پیار کیا تھا۔ بہت چاہا تھا اسے مگر محبت کا جو احساس اسے آج ہوا تھا، وہ یکسر جدا تھا۔ ایسی محبت تو اسے زینب کی پیدائش پر بھی نہ ہوئی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اسے بیٹی سے پیار نہیں تھا۔ زینب بھی اسے بہت پیاری تھی۔ وہ اس کی پیدائش پر بھی بہت خوش ہوا تھا مگر آج بیٹے نے تو جیسے سوکھی زمین پر ساون برسایا تھا۔ ایسا احساس پہلی بار جاگا تھا..... وہ جتنا نہال ہوتا اتنا کم تھا۔

آج اس کا چھوٹا سا گھرانا مکمل ہو گیا تھا اور اس خوشی میں اس نے محلے بھر میں مٹھائی بانٹی تھی۔

وہ خوشی سے سرشار تھا، اس بات سے بے خبر کہ وہ خوشی جلد ہی ماتم میں بدلنے والی ہے۔

☆☆☆

سب سے پہلا انکشاف رخسانہ آپا پر ہوا اور ان کے پیروں تلے سے زمین سرکتی چلی گئی۔

لاڈلے بھائی کی نسل پر یہ داغ..... اتنا بڑا کلنک..... وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

انہوں نے کبھی سوچا تک نہیں تھا کہ کچھ ایسا ہو جائے گا۔

اب کیسے بتائے اس کو۔ وہ جو اس سانحے سے بے خبر خوشیاں منا رہا تھا جس نے تیرہ سال کا بن باس کاٹ کر منزل پائی تھی..... اس کو کیسے خبر کرے کہ سارا سفر لاحاصل تھا۔

مگر بتانا تو تھا ہی اور جتنا جلدی بتایا جاتا، اتنا ہی اچھا تھا۔

UUNOVELS.COM

پورا دن وہ ہمت مجتمع کرتی رہیں۔ الفاظ ترتیب دیتی رہیں۔

پھر شام میں انہوں نے نور حسن کو پاس بٹھا کر پہلے اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ پھر ایکدم سے وہ سچ کہہ دیا جو صرف کڑوا ہی نہیں تھا بلکہ زہریلا بھی تھا۔

اور نور حسن کا سارا وجود نیلا پڑ گیا۔

وہ سانس روکے ساکت سا رخسانہ آپا کو دیکھ رہا تھا۔ کتنی دیر تک تو وہ بول ہی نہ پایا اور پھر جب چپ ٹوٹی تو بھی یقین سلامت تھا۔

''نہیں آپا! تجھے غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔'' اس نے سر جھٹک جھٹک کر تردید کر دی۔

''مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی نور حسن۔ کاش کہ یہ غلط فہمی ہی ہوتی مگر اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہی ہوں۔'' آپا نے نرمی سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''یہی سچ ہے نور حسن۔ میرا یقین کر۔''

''آپا یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ کیسے مان لوں میں؟''

''تجھے میری بات کا یقین نہیں تو لے خود دیکھ لے۔''

رخسانہ نے بچہ لا کر اس کی جھولی میں ڈالا۔

مگر نور حسن کو تو اپنے یقین پر یقین تھا اور دیکھ کر وہ اپنا یقین توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بچے کو بستر پر لٹایا اور بغیر کچھ کہے باہر نکل گیا۔ رخسانہ بے بسی اور ترحم سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

دو دن اس نے بچے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ثریا پکڑاتی بھی تو بہانہ کر کے واپس کر دیتا یا رخسانہ کو دے دیتا۔

اس کا بچہ نامکمل تھا۔ وہ نہ اس کا بیٹا تھا نہ بیٹی۔ اور اس بات پر وہ چاہ کر بھی یقین نہیں کر پا رہا تھا۔

''اللہ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا ہے۔ اتنا طویل انتظار، اتنی دعائیں، اتنا صبر..... اور انعام کیا ملا..... ایک ادھورا وجود.....''

شکوے شکایتیں اور ناشکری سر اٹھانے لگی..... وہ بچہ اسے آزمائش نہیں سزا نظر آنے لگا۔

یہ نامکمل بچہ نہیں چاہیے تھا اسے جو نہ اس کی نسل بڑھانے کے قابل تھا، نہ اس کا نام قائم رکھنے کے بلکہ یہ تو بدنامی کا باعث تھا اس کے لیے۔ کیا کہیں گے لوگ کہ نور حسن ایک ہیجڑے کا باپ ہے۔ کیسی کیسی آوازیں کسیں گے۔

لوگوں کا ان کے ساتھ سلوک، ذومعنی فقرے، گھٹیا مذاق، چھیڑ خانی..... جو اس نے بھی کئی بار کیا تھا بغیر کسی ندامت کے بنا کسی شرمندگی کے..... کیونکہ اس کی نظر میں بھی ایسے ادھورے وجود اسی کے مستحق تھے مگر کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کے گھر میں بھی ایسا وجود آنکھ کھول دے گا۔

اور اب وہ اس حقیقت کا سامنا نہیں کر پا رہا تھا۔

''پھر کیا سوچا تو نے؟'' رخسانہ آپا نے بالآخر خود ہی پوچھ لیا۔

وہ جواب تک شرمندگی سے نظریں چراتا پھر رہا تھا۔ واضح حقیقت کو نظر انداز کر رہا تھا، ٹھٹک کر رک گیا۔

''کیا سوچنا تھا آپا؟'' وہ سمجھا اور نا سمجھی کے بیچ کھڑا تھا۔

''یہی کہ اس کا کیا کرنا ہے۔ کیا پالے گا اس کو؟'' رخسانہ نے سیدھا سوال کیا۔

''تو اور کیا کروں آپا؟'' اس نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔

''پاگل ہو گیا ہے کیا۔ ساری دنیا تھو تھو کرے گی۔ پوری برادری میں مذاق بن کر رہ جائے گا۔''

رخسانہ نے اسے حقیقت کا آئینہ دکھایا۔

''تو اور کیا کروں آپا۔ کہاں جا کر پھینکوں اس کو؟'' بالآخر وہ جھلا گیا۔

''کسی یتیم خانے کے باہر رکھ آیا ہیجڑوں کے گھر چھوڑ آ..... ابھی تو بات گھر تک ہے۔ اس سے پہلے کہ لوگوں کو پتا چلے اس سے جان چھڑا۔'' مشورہ دیا گیا۔

''محلے والے تو جانتے ہیں نا کہ بیٹا ہوا ہے۔ ہر گھر مٹھائی بھیجی تھی میں نے۔ اور ثریا اس کو کیا کہوں؟ کتنی چاہ تھی اسے بیٹے کی، وہ تو برداشت ہی نہیں کر پائے گی۔''

اندر کہیں سے کمزور سے جواز سر نکال کر اٹھنے لگے۔

''ثریا کو پتا چلے گا تو وہ بھی سمجھ جائے گی اور محلے والوں کا کیا ہے، کہہ دیں گے بیمار ہو گیا تھا اسپتال میں رکھا ہے۔ ثریا کو کچھ دن کے لیے میں ساتھ لے جاؤں گی..... تو کہہ دیں گے کہ بچہ وہیں فوت ہو گیا اور وہیں دفنا دیا۔''

رخسانہ آپا نے چٹکیوں میں سارا مسئلہ حل کر دیا۔

وہ اس ادھورے بچے کے ساتھ اپنا نام نہیں جوڑ سکتا تھا۔ اسے پال کر جگ ہنسائی مول نہیں لے سکتا تھا۔ اب بھلائی اسی میں تھی کہ اس سے جان چھڑا لی جائے۔

وہ بھی حقیقت جان چکی تھی مگر چپ تھی۔ کیوں چپ تھی، یہ بس اسے ہی پتا تھا۔

ثریا کی طبیعت سنبھلی تو آپا نے بھی سامان باندھا کہ انہیں بھی جا کر گھر سنبھالنا تھا۔ نور حسن نے سوچا کہ آپا کو چھوڑ کر تسلی سے ثریا سے بات کرے گا۔ جہاں اتنے دن گزرے، وہاں چند دن اور سہی۔

اور پھر وہ دن آ ہی گیا جب اسے ثریا سے بات کرنی پڑی۔

کئی تمہیدوں، بہت سے لفظوں اور ان گنت

جوازوں کو ذہن میں رکھ کر اس نے بات شروع کی۔

''ثریا! دیکھ جو بات میں کرنے لگا ہوں وہ حوصلہ کر کے سننا۔ بس اتنا جان لے کہ ہماری قسمت میں یہی لکھا تھا۔ میں جانتا ہوں تجھے تکلیف ہوگی۔ بہت دکھ ہوگا مگر برداشت کرنا پڑے گا۔'' نور حسن نے تمہید باندھی۔

وہ سمجھ گئی تھی کہ نور حسن کیا کہنا چاہتا ہے اور کیوں نہیں کہہ پا رہا۔

''ہاں، ہمارا بچہ مکمل نہیں ہے۔ مجھے پتا ہے۔'' نور حسن کی ادھوری بات اس نے پوری کر دی۔ نور حسن نے چونک کر اسے دیکھا۔

ثریا سمجھ گئی ہے..... یہ سوچ کر اس کی کب کی رکی سانس بحال ہوئی۔

''تو کیا تجھے دکھ نہیں ہوا؟'' نور حسن کی آنکھوں میں سوال تھا

''ہوا تھا مگر پھر رب کی رضا پر راضی ہوگئی۔ اس کی مرضی جو بھی دے۔''

''دیکھ ثریا! میں مانتا ہوں رب کی مرضی ہے کہ اس نے ہمیں بیٹا نہیں دیا۔ اس پر بھی صبر کر لیا کہ مجھے بغیر وارث کے قبر میں اترنا ہے مگر میں اس ادھورے بچے کو گھر میں نہیں رکھ سکتا۔ اسے نہیں پال سکتا۔ ابھی تو اس کی حقیقت ہمیں ہی پتا ہے، بڑا ہوگا تو سارے محلے کو پتا چل جائے گا۔ لوگ تھو تھو کریں گے۔ پیٹھ پیچھے آوازیں کسیں گے، ہنسی اڑائیں گے اور یہ سب میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اسے کہیں چھوڑ آؤں گا۔''

نور حسن قطعیت سے بولتا چلا جا رہا تھا اور ثریا کا دل اتھل پتھل ہونے لگا۔

''نور حسن! یہ ہماری اولاد ہے۔ ہمارا خون ہے۔ نو مہینے کوکھ میں رکھا ہے میں نے۔ جنم دیا ہے اسے۔ کیسے خود سے الگ کر کے پھینک دوں اور اس معصوم کی کیا غلطی کہ یہ مکمل نہیں ہے۔ یہ تو رب کی مرضی تھی کہ اسے ایسا بنا کر بھیج دیا۔'' نور حسن کے سفاکانہ ارادے پر ثریا تڑپ کر رہ گئی۔

''مانتا ہوں کہ یہ میرا ہی خون ہے۔ میری ہی اولاد ہے مگر اس کے وجود سے جو بدنامی جڑی ہے، وہ مجھے نہیں چاہیے۔ بڑا ہو کر بھی اس نے ہیجڑوں سے ہی جا ملنا ہے تو ابھی سے ہی ان کے پاس چلا جائے تو اچھا ہے۔ ہم بھی بدنامی سے بچ جائیں گے۔'' نور حسن کے لہجے کی مضبوطی ثریا کو دہلانے لگی۔

''دیکھ زینب کے ابا۔ رب کی آزمائش ہے یہ۔ ہو سکتا ہے کہ تو اس سے پیار کرے، اس کو پالے تو رب پوری اولاد بھی دے دے۔ تیرا وارث تیری نسل کا امین تجھے مل جائے۔'' ثریا نے سمجھانے کے ساتھ ساتھ ترغیب بھی دی۔

''اب رب بیٹا دے یا نہ دے مگر مجھے یہ ہیجڑا نہیں چاہیے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اب تو بھی دل کو سمجھا لے۔'' نور حسن قطعیت سے کہتا ہوا باہر نکل گیا اور ثریا اس ننھی سی جان کو گود میں لیے بیٹھی رہ گئی۔

☆☆☆

چھ دن ثریا نے نور حسن سے کوئی بات نہ کی اور نور حسن بھی کام کے لیے زینب کو آواز نہیں دیتا۔ یہ پہلی بار تھا کہ ان کا کوئی جھگڑا اتنے دن چلا تھا۔ ورنہ صبح کے جھگڑے پر شام کو ثریا منا لیتی یا شام کی ناراضگی پر صبح تک نور حسن بول پڑتا۔

ساتویں دن نور حسن نے بچے کے سب کپڑے سمیٹے اور ایک چھوٹے سے بیگ میں رکھنے لگا۔ ثریا چپ چاپ ساری کارروائی دیکھتی رہی۔ چھٹی حس کچھ برا ہونے کا عندیہ دے رہی تھی..... سب سمیٹ کر وہ پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا۔ ثریا کی تمام حسیات بیدار ہوگئیں۔ بظاہر وہ بچے کے کپڑے بدلنے میں مشغول تھی مگر کان نور حسن کی بات پر تھے جو جلد ہی اس کی زبان سے ادا ہونے والی تھی۔

''میں نے ایک جاننے والے سے بات کر لی ہے۔ وہ اسے ایک فلاحی ادارے میں جمع کروا دے گا۔ وہ وہاں اس کا اچھے سے خیال رکھیں گے۔'' وہ فیصلہ سناتے ہوئے تسلیاں بھی دے رہا تھا۔

'' اس کا سامان بھی رکھ دیا ہے۔ لا اب مجھے دے دے اسے، میں دے آؤں۔'' اس نے بچے کی سمت ہاتھ بڑھائے تو ثریا نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ اسے اٹھا کر نہ لے جائے۔

''میں اپنا بچہ کسی کو نہیں دوں گی۔ تجھے اسے نہیں رکھنا نہ رکھ۔ میں اسے خود پال لوں گی۔''

وہ بچے کو سینے سے لگائے دھیمی مگر پُرعزم آواز میں بولی۔

''دیکھ ثریا! ہم اسے نہیں رکھ سکتے۔ ہم کل کو کیا منہ دکھائیں گے لوگوں کو کہ ہمارے گھر ہیجڑا ہوا ہے۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کریں گے۔ تماشا بن کر رہ جائے گا ہمارا۔'' اب کی بار وہ رسانیت سے سمجھانے لگا۔

''تجھے لوگوں کی پروا ہے، اس جان کی نہیں۔ دنیا کا ڈر ہے اللہ کا خوف نہیں؟''

''بکواس بند کر اور آخری بار سمجھا رہا ہوں کہ اسے مجھے لے جانے دے، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

UUNOVELS.COM

''تُو نے جو کرنا ہے کر لے مگر میں اپنا بچہ ایسے نہیں پھینکنے دوں گی۔''

نور حسن تھوڑی دیر اسے تیز نظروں سے گھورتا رہا جیسے بہت ضبط کر رہا ہو اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔

زینب دروازے کی اوٹ سے ماں باپ کی لڑائی سن رہی تھی... جو کچھ کچھ اسے سمجھ آ رہی تھی اور کچھ سر کے اوپر سے گزر رہی تھی۔ وہ خود اس لڑائی سے سہم گئی تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی ایسا اس نے پہلی بار دیکھا تھا کہ کسی بات پر اس کے ماں باپ ایسے لڑے ہوں۔ باپ کے جاتے ہی اس نے کمرے میں جھانکا تو ثریا بے آواز آنسوؤں کے ساتھ مرتضیٰ کو سینے سے لگائے روئے جا رہی تھی۔ ماں کا رونا دیکھ کر اسے بھی رونا آ گیا۔

وہ آہستہ سے چلتی ہوئی ثریا کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ ثریا نے ایک نظر اس کے بہتے آنسوؤں پر ڈالی اور اسے بھی ساتھ لگا لیا۔ اب اس کے رونے میں تیزی آ گئی۔ زینب اور مرتضیٰ کو خود سے چپکائے وہ کتنی ہی دیر روتی رہی۔

☆☆☆

اور پھر فیصلہ ہو گیا۔

نہ ثریا کی مستاہاری اور نہ نور حسن کی دنیاداری۔ ہارا تو ان دونوں کا رشتہ ہار گیا۔ دکھ سکھ میں ساتھ رہنے کا وعدہ ٹوٹ گیا۔

کئی جھگڑوں، کئی تکراروں اور کئی بحثوں کے بعد دونوں نے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ ثریا نے اولاد کو چنا اور نور حسن نے دنیا کو۔

آخری لمحے تک ثریا کے دل میں امید کا دیا جلتا رہا کہ شاید اب نور حسن رک جائے۔ اس کے درد کو سمجھ جائے جیسے بغیر کہے پہلے سمجھ جاتا تھا مگر نور حسن کو نہ سمجھنا تھا اور نہ وہ سمجھا۔

آخر کار وہ لمحہ بھی آ گیا جب امید کا دیا ٹمٹماتے ہوئے آخری سانس لے کر پوری طرح بجھ گیا۔ پھر سے کبھی نہ جلنے کے لیے.....

اور نور حسن نے اسے چھوڑ دیا ہمیشہ کے لیے۔ وہ گھر سے چلا گیا تھا کبھی نہ آنے کے لیے۔

ثریا نے ایک آخری بار آنسو بہائے اور پھر خاموش ہو گئی۔ اب اسے پھر سے نئے سفر کا آغاز کرنا تھا اپنے لیے نہیں مرتضیٰ کے لیے۔ وہ جانتی تھی کہ آگے وقت کٹھن ہو گا مگر اسے مقابلہ کرنا ہو گا حالات کا۔ جس بچے کے لیے اس نے اپنی ازدواجی زندگی کی قربانی دے دی، اب اسے اس کو پالنا ہے۔

پرانا ٹرنک کھول کر اس نے اپنی تعلیمی اسناد کو تلاشا۔ بی ایڈ کا ڈپلوما جو کبھی ایسے ہی وقت گزاری کے لیے کر لیا تھا، آج نعمت محسوس ہوا۔ پہلی فرصت میں اس نے سب قریبی اسکولوں میں درخواست جمع کرا دی اور کسی اچھی خبر کی آمد کے دن گننے لگی۔

ڈیڑھ ماہ کے طویل انتظار کے بعد جب ساری جمع پونجی ختم ہونے کو تھی، اسے ایک اسکول سے بلاوا آ گیا..... کسی پرائیویٹ اسکول کی نوکری اس کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ناکافی تھی مگر ایسے حالات میں وہی غنیمت تھی۔ اس عرصے میں اس نے آس پاس کے گھروں میں بھی ٹیوشن کے لیے کہنا شروع کر دیا تھا اور چند لوگوں نے اپنے بچوں کو بھیجنا بھی شروع کر دیا۔ جیسے تیسے کر کے زندگی کی گاڑی رینگنا شروع ہو گئی۔

مگر اصل مشکل تو مرتضیٰ کی شکل میں ہنوز سامنے تھی۔

ثریا نے پوری کوشش کی تھی کہ کسی کو بھی مرتضیٰ کی جنس کا پتا نہ چل سکے۔ وہ ہمیشہ اسے پورے کپڑے پہنا کر رکھتی۔ کبھی اسے کسی کے ساتھ اکیلا نہ چھوڑتی۔ ہر وقت سائے کی طرح اس سے چپکی رہتی مگر جوں جوں وہ بڑا ہو رہا تھا، اس کا ظاہر اس کے باطن کو عیاں کرنے کے درپے تھا۔

جب تک اسے بولنا نہیں آیا، اسے دیکھنے والوں کو اس میں کچھ الگ محسوس نہیں ہوا تھا۔ مگر اب اس کی آواز کی نزاکت ایک لمحے کے لیے سننے والوں کو چونکانے لگی تھی۔

''بیٹا! اس طرح نہیں بولتے۔''

ثریا اس کے باریک آواز میں بولنے کے انداز پر سرزنش کرتی تو وہ ناسمجھی سے دیکھتا رہ جاتا۔

''تو اماں کیسے بولوں؟''

اور اس ''کیسے'' کا ثریا کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

☆☆☆

ایک دن ٹیوشن کے لیے آئی چھوٹی بچیاں پڑھنے کے بعد وہیں کھیلنے بیٹھ گئیں۔ زینب نے اپنے پرانے کھلونے نکال کر ان کو دے دیے تو وہ اور بھی خوش ہو گئیں۔

بچیاں گھر گھر کھیل رہی تھیں۔ ایک بچی گھڑ بن کر سب کے لیے اسٹیل کے چھوٹے چھوٹے برتنوں میں فرضی کھانا بنانے لگی تو دوسری بچی گھر کی صفائی ستھرائی میں مگن ہو گئی۔

ان سب سے دور ایک کونے میں بیٹھا مرتضیٰ خاموشی سے سب دیکھ رہا تھا۔ اماں کی سختی سے تاکید تھی کہ وہ لڑکیوں والے کسی کھیل کو نہ کھیلے، یہ اور بات کہ اسے وہ سارے کھیل

UUNOVELS.COM

بہت اچھے لگتے تھے اور اس کا دل انہیں کھیلنے کو مچلتا تھا۔۔۔
ایک بچی نے مٹی کے چھوٹے سے چولہے پر جھوٹ موٹ کی ہانڈی چڑھائی۔ اماں کا بڑا سا دوپٹا سنبھالنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی وہ اس وقت گھر کی سربراہ کا کردار ادا کر رہی تھی۔

اور مرتضیٰ اس کھیل کے ایک ایک عمل کو پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ ایسا خاموش تماشائی جو بظاہر کوئی کردار نہیں ہوتا مگر ہر کردار میں خود کو دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد بچیاں کھیل ختم کر کے چلی گئیں۔ سب کھلونے ایسے ہی بکھرے پڑے تھے۔ اماں کا دوپٹا جو کچھ دیر قبل ایک بچی کے دائیں بائیں بے ترتیبی سے جھول رہا تھا، اب ایک طرف پڑا تھا۔ اس نے اٹھ کر دوپٹا اٹھایا اور اپنے اردگرد لپیٹ لیا۔ دوپٹا کافی بڑا تھا سو کئی بل دینے پڑے۔ پھر وہ اسی بچی کی طرح گھڑ خاتون خانہ بن کر چیزوں کو سمیٹ کر سجانے لگا۔ ثریا کسی کام سے کمرے سے نکل کر صحن میں آئی تو سامنے کے منظر نے اس کا خون کھولا دیا۔ تیزی سے اس نے مرتضیٰ سے دوپٹا چھینا اور ساتھ ہی ایک ہاتھ اس کے نازک گال پر نشان چھوڑتا چلا گیا۔

"کتنی بار سمجھایا ہے کہ یہ حرکتیں مت کیا کر۔ سمجھ کیوں نہیں آتی؟" وہ اس پر چلائی۔

اور اسے واقعی سمجھ نہیں آتی تھی کہ اماں اسے کیوں روکتی ہیں۔ جو باقی سب کر سکتے تھے، وہ اسے کیوں نہیں کرنے دیا جاتا؟

وہ بغیر آواز کے آنسو بہاتا ہوا گال پر ہاتھ رکھے کتنی ہی دیر وہاں کھڑا رہا۔

☆☆☆

"دوبارہ بول کر دکھاؤ نا۔"

وہ بچہ اس کا بازو تھامے اس سے فرمائش کر رہا تھا۔ بچے کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ اردگرد کئی اور بچے کھڑے تھے جو اس کے بلانے پر جمع ہوئے تھے۔

اس نے انہیں بھی وہ باریک آواز سنانے کے لیے بلایا تھا جسے سن کر وہ بہت ہنسا تھا اور اب چاہتا تھا کہ اس کے باقی دوست بھی اسے سن کر اتنا ہی انجوائے کریں۔

مرتضیٰ کا اس اسکول میں وہ پہلا دن تھا جو ہرگز خوشگوار نہیں تھا۔ خوشگوار تو سابقہ اسکول کے ایام بھی نہیں تھے۔ یہ سب وہاں بھی ہوتا رہا تھا مگر آہستہ آہستہ وہ ان رویوں کا عادی ہو گیا تھا یا وہاں موجود بچوں کے لیے وہ تفریح پرانی ہو چکی تھی۔ تاہم وہ بہت کم اور انتہائی ضرورتاً ہی بات کرتا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہی چل رہا تھا کہ اچانک ثریا نے اس کا دوسرے اسکول میں داخلہ کروا دیا۔ وجہ کیا تھی اسے نہیں معلوم تھی مگر یہاں اب اسے پھر سے سب مراحل طے کرنا تھے۔

پہلے دن ہی بچے اس کی باریک زنانہ سی آواز سن کر اسے گھیرے ہوئے تھے اور وہ کسی ایسے مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا جیسے جرم کرتے ہوئے رنگے ہاتھ پکڑا گیا ہو۔ اب وہ سب اس کی وہی آواز پھر سے سننے کی فرمائش کر رہے تھے۔

"اے بولو نا۔"

بچے نے اب اس کا ہاتھ کھینچ کر ہلانا شروع کر دیا۔ جیسے وہ بٹک مین ہو اور ٹوپی ہلا کر کچھ ایسا نکال دے گا جو سب کو دنگ کر دے۔ باقی بچے نظریں گاڑے اس جادو کے ہونے کے انتظار میں بے چین تھے۔

یہ سب کب تک چلتا پتا نہیں مگر کلاس ٹیچر آ گئی اور سب تیزی سے اپنی اپنی سیٹوں کی طرف بڑھے۔

"مس! یہ مرتضیٰ لڑکیوں کی طرح بولتا ہے۔" بچہ زیادہ دیر خود کو وہ انکشاف کرنے سے نہیں روک پایا۔ کسی نئی کھوج، نئی دریافت کی خوشی اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔ مرتضیٰ کی نظریں اب ڈیسک سے پھسل کر اپنے جوتوں میں کچھ تلاشنے لگیں۔

"بری بات حمزہ۔" ٹیچر نے بچے کو سرزنش کی۔ "نئے کلاس فیلو کو تنگ نہیں کرتے۔ بلکہ آپ سب کو تو اس سے دوستی کرنی چاہیے۔"

"مس! یہ بولے گا تو دوستی ہو گی نا۔" ایک تیز طرار بچے نے جواب دیا اور باقی بچے دبی آواز میں کھی کھی کرنے لگے۔

ٹیچر نے سب کو ڈانٹ کر چپ کروایا اور کتاب کھولنے کا کہا۔

ٹیچر کی ڈانٹ سے سب بچے خاموش ہو گئے۔ اب ان کا دھیان مرتضیٰ سے ہٹ کر بورڈ پر تیزی سے مارکر چلاتے ٹیچر کے ہاتھ کی طرف تھا۔

مگر وہ ایک وقتی سرزنش تھی جس کا بچوں پر اثر کلاس ختم ہونے تک ہی رہ پاتا اور یہ بات مرتضیٰ اچھے سے جانتا تھا۔

☆☆☆

"ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کے بچے کو اس اسکول میں مزید نہیں رکھ سکتے۔"

پرنسپل مناسب ترین الفاظ میں اسے مرتضیٰ کے اسکول سے نکال دیے جانے کا عندیہ دے رہی تھی۔

"کیا میں وجہ جان سکتی ہوں؟" ثریا نے وجہ معلوم

UUNOVELS.COM

ہونے کے باوجود بھی پوچھنا ضروری سمجھا۔

''مرتضیٰ نارمل بچہ نہیں ہے۔ اس کا یہاں رہنا باقی بچوں کو متاثر کر سکتا ہے بلکہ کر رہا ہے۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا میری بات؟''

پرنسپل نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اس کی جنس کی تخصیص کی اور اسے کسی اچھوت سے مشابہ قرار دے دیا کہ جس کے ہونے سے باقی بچوں کو کوئی بیماری لگ جاتی یا ان کے ساتھ کچھ برا ہو جاتا۔

''میں سمجھ رہی ہوں آپ کی بات..... مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ پڑھائی میں اچھا ہے۔ کسی کو تنگ نہیں کرتا۔ صرف اس کی نامکمل جنس کی وجہ سے آپ اسے اسکول سے کیسے نکال سکتے ہیں؟'' ثریا نے دبے لفظوں میں احتجاج کیا۔

''ہماری مجبوری کو سمجھیں۔ ہم اسے رکھ بھی لیں تو کل کو بچوں کے والدین کو پتا چلے گا تو وہ احتجاج کریں گے۔ اگر ہم نے مرتضیٰ کو نہیں نکالا تو وہ اپنے بچوں کو کسی اور اسکول میں داخل کروا دیں گے۔ ایک ایسے بچے کے لیے ہم باقی بچوں سے ہاتھ تو نہیں دھو سکتے نا۔'' پھر مزید کہا۔

''آپ تو خود ٹیچر ہیں۔ ان سب معاملات کو اچھے سے سمجھتی ہیں۔''

اور ثریا سب سمجھتی تھی۔ اسے ہی سمجھنا پڑتا تھا۔ اتنے سالوں سے سمجھتی ہی تو آئی تھی۔

ابتدائی سالوں میں وہ اپنے اسکول میں ہی مرتضیٰ کو لے جاتی رہی۔ طوہاً و کرہاً اس کے وہاں ٹیچر ہونے کی بنا پر اسکول انتظامیہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایسے بچے کو برداشت کرتی رہی۔

بچوں کے لیے وہ ٹیچر کا بیٹا تھا لہٰذا کسی حد تک خیال کر جاتے مگر پرائمری کے بعد وہاں صرف بچیوں کو پڑھایا جاتا تھا اس لیے مجبوراً ثریا کو اسے دوسرے اسکول میں داخل کروانا پڑا اور یہیں سے ایک نئی آزمائش کا آغاز ہوا۔

چند ماہ کے بعد اسکول انتظامیہ کی طرف سے اسے نکالنے کا نوٹس مل جاتا۔ اگلے سالوں میں مرتضیٰ نے اسکول میں کم اور گھر میں زیادہ پڑھا۔

سات اسکول اور چار محلے تبدیل کر کے وہ میٹرک تک آ گیا تھا۔ میٹرک کے بعد اس نے اسکول کا رخ نہیں کیا۔ گھر پر ہی تیاری کر کے پرائیویٹ ایف اے کے پیپرز دیے اور اب وہ پرائیویٹ بی اے کی تیاری کر رہا تھا۔

انیس سال کی عمر تک آتے آتے وہ اچھے سے جان گیا تھا کہ وہ باقی سب سے کتنا الگ ہے..... اور وہ لوگوں کے لیے کیا ہے یہ تو وہ بہت پہلے ہی جان چکا تھا۔

اپنے وجود کی شناخت سے بھی قبل جب نو سال کی عمر میں اس نے چاچا قدیر کے اپنی طرف بڑھتے ہاتھوں کی غلاظت محسوس کی اور جب اس نے اپنا بے جان وجود پاتال میں گرتا دیکھا..... جب وہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کو سمجھ تک نہیں پا رہا تھا۔

وہ محض نو سال کی عمر میں جس اذیت سے گزرا تھا، وہ اسے یہ بات سمجھانے کے لیے کافی تھی کہ وہ اپنے گھر سے باہر محفوظ نہیں ہے اور کیوں محفوظ نہیں ہے، یہ جاننے میں اسے کچھ وقت لگا۔

وہ گھر تک محدود رہنے لگا۔ دوست پہلے ہی کوئی نہیں تھے کیونکہ پڑوس کے سب ہی بچوں کو اس کے ساتھ نہ کھیلنے کی سختی سے ہدایت تھی۔ اب اس نے باہر جانا بالکل بند کر دیا تھا۔ اس نے ثریا کو کچھ نہیں بتایا مگر وہ پھر بھی سب جان گئی تھی۔ پتا نہیں کیسے؟ شاید اس کے چہرے پر اترے خوف سے یا شاید اس کے تار تار وجود سے۔

ثریا نے اس سے کچھ نہیں پوچھا مگر کچھ دنوں بعد وہ ایک نئے محلے میں شفٹ ہو گئے۔ مرتضیٰ جانتا تھا کہ اب پھر سے اسی کہانی کا آغاز ہوگا۔

صرف چہرے بدلیں گے مگر کردار وہی رہیں گے۔ کہانی اسی کی ہوگی۔ سب تماشائی ہوں گے اور وہ کھیل ہوگا..... محض ایک کھیل۔

☆☆☆

مرتضیٰ نے کبھی کسی سے کوئی شکایت نہیں کی تھی مگر رب سے اسے بہت سی شکایتیں تھی۔ رات کے آخری پہر میں وہ اکثر اللہ سے بہت سے شکوے کرتا تھا۔

'خدا نے مجھے ایسا کیوں بنایا ہے؟ اگر خدا نے قبول کر لیا تو لوگ قبول کیوں نہیں کرتے؟ کیوں خدا کی دین پر سوال کرتے ہیں؟'

اس کی آنکھیں کتنی ہی دیر تکیے کو بھگوتی رہتیں۔

کبھی کبھی اس کا شدت سے دل چاہتا کہ چیخ چیخ کر لوگوں کو کہے کہ نامکمل میں نہیں تم سب ہو۔ تم سب ذہنی طور پر ادھورے ہو جو تمہیں مجھ میں کاملیت کی تلاش ہے۔

کبھی کبھی اس کا شدت سے دل چاہتا کہ سب کی اصل صورتیں عیاں ہو جائیں۔ بغیر کسی تمہیدی لبادوں کے، بنا کسی سجاوٹ کے ان سب کے مسخ اور مکروہ چہرے سامنے آ جائیں اور وہ پھر سب کو آئینہ دکھائے کہ دیکھو یہ تمہارا اصل ہے۔ تم سب کتنے ادھورے اور ناقابلِ برداشت ہو۔

UUNOVELS.COM

مگر کون راضی ہوتا اپنی اصل صورت دیکھنے کو۔ اسے قابلِ برداشت بنانے کو منافقت کے پہناوے پہنانے پڑتے ہیں..... لفظوں کے ہیر پھیر سے الٹا سیدھا کرنا پڑتا ہے تاکہ مسخ صورت دلکش ہو جائے۔

اور مرتضیٰ کبھی ایسے الفاظ نہ کھوج پایا جو اس کے نامکمل وجود کو پورا کر سکیں۔

☆☆☆

''میں صدقے میں واری۔ کتنی سوہنی لگ رہی ہے۔''

بیلا نے اس کا میک اپ مکمل کر کے اس کی بلائیں لیں۔

''ایمان سے کہتی ہوں اگر بیلا مرد ہوتی تو پاگل ہو جاتی تیرے عشق میں۔'' اس نے اب وگ اس کے سر پر اچھی طرح سے جماتے ہوئے اسے پیار سے دیکھا۔

مگر وہ سپاٹ چہرہ لیے خاموش بیٹھا رہا۔

''چل آ ذرا اپنا روپ تو دیکھ شیشے میں۔'' اس نے اسے سنگھار میز کے سامنے لا کھڑا کیا۔

''قسم سے بس ناچ سیکھ لے تو آگ لگا دے۔ سارے شہر میں بس تیرے نام کا ڈنکا بجے۔''

وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوئی جا رہی تھی اور وہ ساکت کھڑا اپنے اس روپ کو دیکھ رہا تھا جو وہ نہیں تھا مگر وہی تھا یا شاید جو نظر آ رہا تھا وہی اس کا اصل تھا جس سے وہ اتنے سالوں تک بھاگتا رہا تھا۔

بس یہی انجام تھا میرا، جس سے بچانے کو اماں سالوں سب سے لڑی۔ اپنا گھر توڑا..... اذیتیں سہیں۔ اس کی آنکھیں نم ہونے لگیں تو اس نے دھیرے سے آنکھیں خشک کیں اور شیشے سے دور ہٹ گیا۔

گرو جی کے ڈیرے پر آئے اسے دس روز ہو گئے تھے جبکہ گھر سے نکلے تقریباً مہینا بیت چکا تھا۔

زینب کا رشتہ ٹوٹنے کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ مزید اس کی اذیت کا باعث نہیں بنے گا۔ کہیں دور چلا جائے گا۔ اتنا دور کہ اس کی نحوست کا سایہ اس کے مقدر پر نہ پڑ سکے۔

اس دن زینب بہت چیخی چلائی۔ بتیس سال کا سارا زہر اگلتی رہی اور وہ زہر دھیرے دھیرے مرتضیٰ کے وجود میں سرایت کر کے اسے بے جان کرتا چلا گیا۔

ثریا اس رات دیر تک مرتضیٰ کے پاس بیٹھ کر روتی رہی مگر دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہ کہا۔ کہتے بھی تو کیا..... کوئی بھی الفاظ تکلیف کا مداوا کرنے سے قاصر تھے۔

صبح مرتضیٰ نے ثریا سے کہہ دیا کہ وہ جا رہا ہے۔ اور ثریا یہ تک نہ پوچھ پائی کہ کہاں؟

اور پوچھ کر کرتی بھی کیا؟ اس سوال کا جواب اسے پتا تھا اور مزید کچھ پوچھنے کے قابل زینب نے چھوڑا نہیں تھا۔

زینب صبح سے کمرے میں بند تھی مگر باہر ہونے والی ہر حرکت کی اسے بخوبی خبر تھی۔ اسے مرتضیٰ کے جانے کا بھی پتا تھا۔ باوجود تمام تر ندامت کے اس نے مرتضیٰ کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ شاید وہ جانتی تھی کہ یہی بہترین قدم ہے جسے شاید بہت پہلے اٹھ جانا چاہیے تھا۔

گھر سے نکلتے وقت وہ اپنے دو جوڑے کپڑوں کے ساتھ تیسری چیز ثریا کی اور اپنی تصویر لے کر آیا تھا۔ باقی سب چھوڑ آیا تھا حتیٰ کہ اپنی تعلیمی اسناد تک بھی۔

اور تمام اسناد اب مرتضیٰ کے لیے بے کار چیزیں تھیں اور اس کا ادراک ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا جب ایف اے کے رزلٹ کے بعد اس نے کتنے دن تک ہر اخبار چھانا کتنی ہی جگہوں پر درخواست بھیجی اور اسے بلایا بھی گیا مگر ہمیشہ اس نے ایک ہی بات سنی۔

''ہم خواجہ سراؤں کو نوکری پر نہیں رکھتے۔ دفتر کا ماحول خراب ہوتا ہے۔'' یہ وہ جواب تھا جو اسے تقریباً ہر جگہ سے سننے کو ملا۔

مگر اس جواب کے ساتھ کتنی ہی جگہوں پر اپنے وجود میں پیوست ہوتیں، چبھتی، پیغام دیتی نظریں بھی محسوس کیں۔

اور مرتضیٰ بس سوچ کر رہ جاتا کہ کسی خواجہ سرا کو باعزت نوکری دینے سے ماحول خراب ہوتا ہے مگر اس کی عزت اتارنے سے ماحول کو کچھ نہیں ہوتا.....

اس نے چھوٹی سے چھوٹی نوکری کے لیے اپلائی کیا مگر جواب وہی رہا۔ حتیٰ کہ گھریلو ملازم تک بننے کی کوشش کی مگر کوئی رکھنے کو تیار نہ تھا۔ ایسے میں وہ ڈگریاں اور تعلیم اس کے لیے صرف ثریا کو خوش کرنے کا راستہ تھی ورنہ وہ جانتا تھا کہ ان سب کا اس کے لیے اب کوئی مصرف نہیں۔

جانے کیوں ثریا اب تک اس خوش فہمی میں جی رہی تھی کہ مرتضیٰ پڑھ لکھ جائے گا تو یہ معاشرہ اسے قبول کر لے گا جبکہ مرتضیٰ کب کا حقیقی دنیا میں قدم رکھ چکا تھا۔ اس نے جان لیا کہ انسانوں کی بستی میں ایک خواجہ سرا صرف تماشا ہو سکتا ہے، تماش بین نہیں۔ اسے بھیک تو مل سکتی ہے مگر نوکری نہیں۔

☆☆☆

''ہو گئیں تم دونوں تیار؟'' گرو جی نے کمرے میں جھانک کر پوچھا۔

UUNOVELS.COM

"جی گروجی ہو گئیں۔" بیلا چہکی۔

"اور یہ دیکھیں، کتنی سوہنی لگ رہی ہے ہماری لاڈو رانی۔" بیلا نے اسے گروجی کے سامنے کیا۔

"ماشاء اللہ کیا روپ چڑھا ہے۔ کسی ریشم کی طرح نرم ملائم..... بس آج سے تیرا نام ریشم ہے۔"

گروجی نے اس کے گال تھپتھپا کر اسے نیا نام دیا۔

وہ اب بھی خاموش کھڑا تھا۔ بیلا اسے تیار کر کے خود تیار ہونے چلی گئی۔

"کیا بات ہے ریشم..... اداس کیوں ہے اتنی؟"

گروجی نے اس کی آنکھوں میں چھپے درد کو بھانپ لیا۔ "جو بھی تیرے دل میں ہے نا سب بول دے مجھ سے۔ آج سے میں ہی تیری ماں ہوں، میں ہی تیرا باپ۔ میں گرو ہوں تم سب کی۔ تم سب میرے بچے ہو۔ تم میں سے کسی کی بھی اداسی دل کاٹ دیتی ہے میرا۔ بول میرا بچہ کیا بات ہے؟"

گروجی نے اسے پیار سے پچکارا تو اس کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

"کچھ نہیں گروجی، بس ماں کی یاد آ گئی تھی۔ اس نے بڑے دکھ اٹھائے کہ میں کبھی ایسا نہ بنوں مگر دیکھو پھر بھی میں یہ سب کر رہا ہوں۔"

"چل ادھر آ کر بیٹھ۔" گروجی نے اسے پلنگ پر بٹھایا اور خود موڑھا کھینچ کر ساتھ بیٹھ گیا۔

"دیکھ ریشم! ہم لوگ ایسے ہی بنے ہیں اور ہمیں ایسے ہی رہنا ہے۔ کتنا بھی اپنے اصل سے بھاگ لیں، ایک دن قدم یہیں آ کر رکتے ہیں۔" گروجی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"کتنے سال اور رہ لیتی تو وہاں؟ ایک دن تجھے یہیں آنا تھا۔ وقت یا حالات کبھی نہ کبھی ادھر دھکیل ہی دیتے۔"

'حالات اور وقت سے زیادہ تو کسی اپنے نے دھکیلا ہے' اس نے دل میں سوچا مگر زبان چپ رہی۔

"ہم میں سے کوئی بھی خوشی سے یہاں رہنے نہیں آیا ریشم۔ سب کو زندگی نے پھینکا ہے اور ہم میں سے کسی کا بھی اس زندگی کے آگے کچھ بس نہیں چلتا ورنہ کبھی ایسی دربدری نہ چنتے۔" گروجی کی آواز میں اداسی نمایاں تھی۔

"گروجی! آپ یہاں کیسے آئیں؟" بلا ارادہ سوال زبان سے پھسلا۔

گروجی نے ایک نظر اسے دیکھا اور سرد آہ بھری۔

"شاید ایک ماہ کی تھی میں جب میرا باپ ایک رات مجھے چپکے سے اٹھا کر کھیتوں میں لے گیا۔ گلا گھونٹ کر مارنے والا تھا کہ گلابو کی نظر پڑ گئی مجھ پر اور اس نے منتیں کر کے مجھے اس سے لے لیا۔ میرے باپ نے سوچا کہ اچھا ہے جان چھوٹی، قتل کا گناہ کرنے سے بچ گیا اور اس وعدے پر اس کو دے دیا کہ اس کا مجھ سے تعلق کبھی کسی کو پتا نہ چلے اور وہ مجھے لے کر کبھی اس علاقے میں قدم نہ رکھے۔ پھر گلابو نے مجھے اپنے بچے کی طرح پالا پوسا۔ جوان کیا اور چھمیاں نام رکھا میرا۔ مجھے ناچ سکھایا، گانا سکھایا اور اپنے فن میں طاق کر دیا۔"

گروجی ماضی کے دھندلکوں میں کھونے لگے

"جب جوان ہوئی تو ساری برادری میں میرے ناچ اور خوبصورتی کی دھوم تھی۔ دور دور سے بلاوے آتے تھے۔ پھر ایک دن چودھری برکت کے پنڈ سے بلاوا آیا۔ چھتیس مربعوں کے مالک چودھری کے بیٹے کا ویاہ تھا۔ چودھری رج کے رنگین مزاج تھا۔ کسی دوسرے پنڈ کے ایک ویاہ میں اس نے مجھے دیکھا اور عاشق ہو گیا۔ گلابو نے کبھی مجھ سے دھندے کا نہیں کہا مگر خالی ناچ گانے کی کمائی سے پیٹ کب بھرتا ہے تو مجبوراً مجھے کبھی کبھار یہ سب کرنا پڑتا تھا۔ میں روز یہ سب نہیں کرتی تھی مگر جب کبھی اچھے پیسے مل جاتے میں تیار ہو جاتی۔ اس دن بھی چودھری برکت کے بلاوے کے ساتھ رات گزارنے کی پیشکش بھی تھی۔ اچھی خاصی رقم مل رہی تھی چنانچہ میں نے فوراً ہامی بھر لی۔"

"گلابو بوڑھی ہو گئی تھی مگر اس کی ہڈیوں میں بڑی جان تھی۔ وہ اب بھی میرے ساتھ جاتی تھی۔ اس دن بھی ساتھ گئی تھی۔ ناچ گانے سے فارغ ہو کر چودھری برکت نے ہمیں مردانے میں بلایا تو میں اور گلابو اس سے ملنے چل پڑے۔ چودھری ساٹھ کے پیٹے کا تنومند آدمی تھا۔ گلابو کافی دیر اسے مچی مچی آنکھوں سے گھورتی رہی اور وہ مجھ پر نظریں گاڑے دیکھتا رہا۔ یکدم گلابو نے چودھری سے وہ پوچھ لیا جس نے مجھے اور چودھری کو ہلا کر رکھ دیا۔"

"تو وہی آدمی ہے نا جو دسمبر کی رات میں کماد کی فصل میں ایک بچے کو مارنے گیا تھا اور ایک ہیجڑے نے تجھ سے وہ بچہ لے لیا تھا؟"

"اے..... کیا بکواس کر رہی ہے۔ کون ہے تُو؟"

چودھری نے گھور کر اسے دیکھا۔

"میں وہی ہیجڑا ہوں چودھری صاحب اور یہ چھمیاں وہی بچہ جسے آپ اس رات مارنے گئے تھے۔"

چودھری قہر آمیز نظروں سے ہمیں گھورتا رہا۔

"اپنی یہ بکواس بند کرو۔ میرا کسی ہیجڑے یا ایسے

UUNOVELS.COM

بچے سے کوئی تعلق نہیں۔ زیادہ زبان چلائی تو کاٹ کر پھینک دوں گا۔" چودھری گرجا۔

"اوئے طفیا کہاں مر گیا؟" اب کی بار اس نے بلند آواز سے کسی کو بلایا۔

"جی چودھری صاحب..... حکم؟"

ایک لمبے چوڑے ڈیل ڈول کا شخص فوراً حاضر ہوا۔

"اٹھا کر باہر پھینکو ان دونوں کو اور دوبارہ کبھی پنڈ میں دکھائی دیں تو زندہ زمین میں گاڑ دینا۔" چودھری نے آگ برساتی نظروں سے ہمیں گھورا اور کمرے سے نکل گیا۔

"میں اور گلابو چپ چاپ واپس گھر چلے آئے۔ اس دن مجھے اپنے اصل کا پتا چلا۔ گلابو نے اس سے پہلے مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا تھا اور نہ ہی کبھی میں نے اس سے کچھ پوچھا تھا۔ پوچھ کر کرتی بھی کیا۔ ہم جیسوں کی کہانی میں کچھ بھی خاص نہیں ہوتا۔ ہم لوگوں کی ان چاہی اولادیں ہوتی ہیں جنہیں وہ ہم جیسوں کی ہی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔

"اپنا اصل جان کر بھی مجھے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ اس سے میری تکلیف بڑھی تھی، کم نہیں ہوئی تھی۔ اگلی صبح میری زندگی پھر سے سابقہ معمول پر آ گئی مگر اس صبح کی رات نے سب بدل کر رکھ دیا۔ رات کو ہمارے گھر میں تین لوگ گھس آئے۔ وہ مجھے مارنا چاہتے تھے۔ کتنی ہی دیر میں اور گلابو ان کے سامنے ڈٹے رہے۔ کتنی جگہوں پر مجھے اور گلابو کو چاقو لگے مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ جو ہاتھ آیا اس سے ان کا مقابلہ کیا۔ ایک چاقو کا نشان تو آج بھی میرے بازو پر موجود ہے۔" گروجی نے آستین چڑھا کر اسے زخم کا نشان دکھایا جہاں اب گوشت ابھر کر چڑھا ہوا تھا مگر کھال کی رنگت کا فرق نمایاں تھا۔

"اور پھر..... میری جان بچاتے ہوئے گلابو نے اپنی جان دے دی۔" اتنا کہہ کر گروجی خاموش ہو گئے۔ ان کی آنکھوں کی نمی گزرے وقت کی تکلیف کو دہرا رہی تھی۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد وہ پھر بولنے لگے۔

"وہ برکت کے غنڈے تھے۔ چودھری کسی بجڑے کے ساتھ اپنی رات رنگین کرنے کو تو تیار تھا مگر وہی بجڑا اسے بطور اولاد منظور نہیں تھا۔ اس کے بعد میں نے وہ علاقہ چھوڑ دیا اور یہاں اس شہر میں آ گئی۔ تب سے یہیں ہوں۔ اپنے جیسوں کے ساتھ ہوں اور ان کو پال رہی ہوں۔"

گروجی اپنی داستان سنا کر پھر سے خاموش ہو گئے اور مرتضیٰ ایک بوڑھے چہرے کو دیکھتا رہا جہاں گردشِ ایام کی داستان رقم تھی۔

"یہ بیلا سات سال کی عمر میں آئی تھی میرے پاس۔ اس کی ماں خود چھوڑ کر گئی تھی اور ریما نے گیارہ سال کی عمر میں خود گھر چھوڑا تھا۔ وہ اس گھر میں رہ تو رہی تھی مگر گھر والے بس اس کی موت کے خواہاں تھے۔"

کافی دیر کی خاموشی کے بعد گروجی نے پھر سے بولنا شروع کیا۔

"پتا ہے ریشم یہ دنیا تیرے میرے جیسے لوگوں کے لیے بنی ہی نہیں ہے۔ یہاں لوگ کسی اندھے، گونگے لنگڑے کو تو رحم سے دیکھتے ہیں انسان مانتے ہیں مگر ہم جیسے لوگ ان کے نزدیک اچھوت ہیں..... ادھورے ہیں۔ انہیں ہم پر کبھی رحم نہیں آتا بلکہ ہنسی آتی ہے۔ ہم صرف ایک تحول ایک مذاق ہیں، ان کے نزدیک جو ان کو ہنسانے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔"

گروجی کی آنکھیں کھارا پانی اگلنے لگیں تو مرتضیٰ کو بھی ہونٹوں پر نمکین ذائقہ محسوس ہوا۔

"ریشم! زمانہ چاہے پچاس سال بعد کا ہو یا پہلے کا..... ہم جیسوں کی قسمت ایسی ہی رہے گی۔ ہر دور میں ہم تماشا تھے اور تماشا ہی رہیں گے۔ اس تماشے کو ہی ہماری روزی روٹی بننا ہے ورنہ بھوکے پیٹ مریں گے مگر تماشا ہمارا پھر بھی لگے گا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں گروجی۔ بالکل ٹھیک..... مجھے اب یہیں رہنا ہے، تماشا بننا ہے۔"

مرتضیٰ اب گروجی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

☆☆☆

مرتضیٰ کو یہاں آئے کئی مہینے بیت گئے تھے۔ اس نے ناچ گانا بھی کافی حد تک سیکھ لیا تھا مگر اب بھی وہ پوری طرح اس ماحول میں ایڈجسٹ نہیں ہو پا رہا تھا۔ بیلا یا ریما کی طرح اسے اٹھلا کر چلنا نہیں آیا تھا۔ ضد کر کے پیسے نکلوانے میں بھی وہ بالکل کورا تھا۔ بلکہ وہ تو بول ہی نہیں پاتا تھا۔ بس بیلا اور ریما کے ساتھ ساتھ کھڑا رہتا۔

بیلا کے بار بار کہنے پر بھی اس نے بال نہیں بڑھائے تھے۔ وہ وگ ہی لگاتا تھا۔ انہیں بتانے کے لیے اس کے پاس جواز تھا کہ اسے اماں کے پاس جانا ہوتا ہے۔ وہ بڑھے ہوئے بالوں کے ساتھ ان کے پاس نہیں جا سکتا۔ وہ انہیں نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں رہ رہا ہے اور کیا کرتا ہے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ خود بھی بال بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

ثریا نے اسے لڑکے کی طرح پالا تھا تو اس کی سوچ،

UUNOVELS.COM

اس کی پسند، اس کا پیسا وا ویسا ہی تھا۔ عورت کا روپ تو عارضی تھا جو اسے لینا پڑتا تھا۔ وہ اس کے لیے نوکری تھی جس سے اسے کچھ رقم کمانا تھی۔ وہ جو کچھ کر رہا تھا، وہ اس کی مجبوری تھی خوشی نہیں۔

اس نے ثریا سے جھوٹ نہیں بولا تھا کہ اسے نوکری مل گئی ہے۔ وہ یہ سب نوکری سمجھ کر ہی کر رہا تھا۔ ایک ہیجڑے کو ایسی ہی نوکری مل سکتی تھی۔ اس عرصے میں وہ دو بار رات میں جا کر چپکے سے ثریا سے بھی مل کر آیا تھا۔ ثریا نے اب پھر محلہ تبدیل کر لیا تھا۔ ایک جگہ زینب کے رشتے کی بھی بات چلائی ہوئی تھی۔ ثریا کی کوشش تھی کہ زینب کی جلد از جلد شادی کر کے مرتضیٰ کو واپس بلا لے۔ زینب کی شادی کی وجہ سے ہی تو وہ اس گھر سے گیا تھا۔

اب آس پاس والوں کے لیے ثریا کی اکلوتی اولاد صرف زینب تھی جس کی اسے شادی کرنا تھی۔

☆☆☆

''کتا کمینہ..... سمجھتا کیا ہے خود کو۔ اس کی تو میں.....'' ریما نے غصے سے دروازہ کھولا اور تن فن کرتی اندر آئی۔

''کیا ہوا ریما؟'' مرتضیٰ اور بیلا اس کی طرف لپکے۔

ریما کو اتنے غصے میں مرتضیٰ نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ وہ بڑے دھیمے مزاج کی تھی۔ اپنے کام سے کام رکھتی تھی۔ مرتضیٰ کو وہ باقی سب سے زیادہ اچھی لگی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ صرف ناچ گانا کرتی تھی، دھندا نہیں کرتی تھی۔

''وہ سالا..... دلاور اس کے آدمی دھمکی دے رہے تھے مجھے کہ شرافت سے ان کے ساتھ چلوں ورنہ زبردستی اٹھا لیں گے۔ اس کی تو.....'' ریما کی گالیاں ایک بار پھر شروع ہو گئیں۔

''اس کمینے کی اتنی مجال..... میں گرو جی کو بتاتی ہوں۔ وہ اس کو سیدھا کروا دیں گے۔ ساری برادری کو اس کی گلی میں بھیج کر ایسا تماشا لگوائیں گی کہ ساری عمر یاد رکھے گا۔'' بیلا کو بھی غصہ آ گیا۔

''نہیں رہنے دے۔ اس خبیث کو تو میں خود سیدھا کر دوں گی۔ سمجھتا کیا ہے خود کو۔ پیسا ہے تو کیا سب کو خرید لے گا سالا.....''

ریما کا پارا اب تک ہائی تھا۔ بیلا اور مرتضیٰ اس کا غصہ کم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔

دلاور برسر اقتدار پارٹی کے ایم این اے چودھری اکرام کا چچیرا بھائی تھا اور خود بھی سیاسی طور پر خاصا سرگرم تھا۔ ایک عیاش اور بدکار شخص میں جتنی برائیاں ہو سکتی ہیں، وہ سب اس میں تھیں۔ گزشتہ ہفتے سگنل پر اس کی گاڑی رکی تو شامت کی ماری ریما اس کی گاڑی کا شیشہ بجا کر پیسے مانگنے لگی۔ اس نے پانچ سو کے ایک نوٹ کے ساتھ اپنا کارڈ دے کر اسے شام میں اپنی کوٹھی پر آنے کا کہہ دیا۔ ایسے بلاؤں سے ریما خوب اچھی طرح واقف تھی... اور ایسی پیش کش کرنے والوں کی موقعے پر ہی خوب تواضع کرنے میں بھی پیش پیش رہتی تھی۔ اس نے نوٹ اور کارڈ پھاڑ کر اس کے منہ پر مارا اور گالیاں دیتی ہوئی دوسری گاڑیوں کی طرف بڑھ گئی۔

شام تک وہ یہ بات بھول بھی چکی تھی کیونکہ جانے ایسے کتنے ہی لوگ روز سڑک پر مل جاتے تھے جو ذومعنی فقرے کستے، گندے اشارے کرتے اور ساتھ چلنے کی دعوت دیتے۔ یہ سب روز کا معمول تھا جنہیں وہ دو چار گالیاں دے کر وہیں حساب چکتا کر آتی۔

مگر دلاور کے لیے یہ روز کا معمول نہیں تھا۔ ایک ہیجڑے نے اسے انکار کیا اور گالیاں دیں۔ یہ بات بھلائی نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے اپنے آدمیوں سے ریما کا ٹھکانا معلوم کیا اور دھمکی آمیز پیغامات بھیجنا شروع کر دیے۔ ریما نے ان سب دھمکیوں کو چٹکی سے اڑایا اور اپنا معمول جاری رکھا اور یہیں وہ غلطی کر بیٹھی۔

☆☆☆

دیساں دا راجا۔ میرے بابل دا پیارا۔ امبڑی دے دل دا سہارا' نی ویر میرا گھوڑی چڑھیا.....

ریما ٹھمکے لگا رہی تھی اور بیلا ناچنے کے ساتھ ساتھ لہک کر گا بھی رہی تھی۔ بیلا کی آواز ان سب میں خاصی اچھی تھی سوز یا درد تو وہی گاتی تھی۔

مرتضیٰ بھی رنگین لباس میں ملبوس میک اپ زدہ چہرے کے ساتھ ان کا ساتھ دینے کی پوری کوشش کر رہا تھا مگر یہ کوشش کچھ خاص کامیاب نہ تھی۔

وہ تینوں کسی کی شادی میں پہنچے ہوئے تھے۔ براتیوں کے آگے آگے ناچتے گاتے ہوئے جا رہے تھے۔ برات میں شامل لوگ باقاعدہ فرمائش کر کے ان سے ڈانس کروا رہے تھے۔ ساتھ ساتھ کئی منچلوں کی چھیڑ خانی بھی جاری تھی۔

دُلہے کے دوست اور کئی براتی نوٹ ہاتھ میں لہراتے تو ریما جھومتی ہوئی جا کر ان سے وہ نوٹ اچک لاتی۔ کبھی کبھی تو نوٹ پہلی کوشش میں ہی ہاتھ آ جاتا اور کبھی دینے والا خوب ستاتا.....

برات میں ناچ گا کر پیسے سمیٹ کر انہوں نے واپسی کا ارادہ کیا تو بیلا نے وہاں سے کھانا بھی شاپر میں ڈلوا لیا۔ اگرچہ ابھی کھانا کھلنے میں وقت تھا مگر بیلا کے آگے کس کی چلتی

تھی۔ وہ ایسے کاموں میں ماہر تھی۔ منتظمین نے بھی اپنی جان چھڑانے کو انہیں کھانا نکال کر دے دیا۔ برات والے گھر سے دو گلیاں چھوڑ کر ایک گھر میں بیٹے کی ولادت ہوئی تھی۔ یہ خبر برات میں پڑی تو اس نے وہاں سے نکلتے ہوئے اس گھر کا پتا بھی پوچھ لیا۔

وہاں جاتے ہوئے راستے میں کئی بچے بھی ان کے پیچھے آنے لگے۔ بڑوں کی دیکھا دیکھی بچے بھی انہیں ستانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہ رہے تھے۔ بیلا نے چند گالیاں دے کر انہیں بھگانے کی کوشش کی مگر بچے خاصے ڈھیٹ تھے۔

اس گھر کے سامنے پہنچ کر بیلا نے بدھائی کے بول اونچے سروں میں گانا شروع کر دیے۔ آس پاس کے گھروں سے گردنیں نکل کر باہر جھانکنے لگیں مگر اس گھر کا دروازہ نہیں کھلا جس پر انہوں نے ہلا بولا تھا۔

گھر کے مکین یا تو لمبی تان کر سو رہے تھے یا پھر جان بوجھ کر دروازہ نہیں کھول رہے تھے۔ مگر وہ تینوں بھی پوری ڈھٹائی سے وہاں براجمان تھیں۔

گلی میں لوگوں کا رش بڑھنے لگا۔ گزرنے والے مفت کا تماشا دیکھنے کے لیے رک رہے تھے۔ کئی گھروں کی کھڑکیوں اور دروازوں کی اوٹ سے دبی دبی ہنسی اور آوازوں کے ساتھ دوپٹوں کی جھلک بھی نظر آ رہی تھی۔

ناچار اس گھر کے مکینوں کو دروازہ کھولنا پڑا۔ بہت بحث و تکرار کے بعد ریما اور بیلا نے ان سے پیسے نکلوائے اور واپسی کی راہ لی۔

واپسی تک سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ گھر پہنچتے ہی ان تینوں نے شاپروں سے نکال کر کھانا کھایا اور بیلا لمبی تان کر سو گئی۔ البتہ ریما نہانے کے لیے چلی گئی۔ نہانے کے بعد وہ اپنے لمبے بالوں میں کنگھی کرنے لگی اور مرتضیٰ بچا کھچا کھانا اور برتن سمیٹنے لگا۔

''مرتضیٰ! تو یہاں کیوں چلا آیا؟ جیسے بھی رہ رہا تھا، اپنے گھر میں ہی رہتا نا۔''

اچانک سے ریما نے اس سے پوچھا۔ وہ واحد تھی جو اسے اس کے اصلی نام سے پکارتی تھی۔

''وہاں اب مزید نہیں رہ سکتا تھا ریما باجی۔ آپ تو سب جانتی ہیں کہ میں کن حالات میں نکلا ہوں۔''

مرتضیٰ نے افسردگی سے جواب دیا۔ بیتے دنوں کی یاد ذہن کے پردے پر لہرانے لگی۔

''جانتی ہوں اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ بولنے دیتا بہن کو۔ سن لیتا دو چار باتیں مگر وہیں رہتا۔ تو ابھی بچہ ہے۔ دنیا دیکھی ہی کہاں ہے تو نے۔ پناہ گاہ چھوڑ کر بھیڑیوں کے جھنڈ میں آ گیا ہے تو۔''

''چلا جاؤں گا ریما باجی۔ بس زینب کی شادی ہو جائے۔ اس کے بعد اماں کو لے کر کہیں دور چلا جاؤں گا۔ بس تب تک کچھ پیسے جمع کر لوں۔'' سہانے مستقبل کی امید اس کی آنکھوں میں چمکنے لگی۔

''بھلا ہے تو۔ اب نہیں جا پائے گا۔ ایک بار جس کا رشتہ کٹ جائے نا اپنوں سے وہ پھر چاہ کر بھی جوڑ نہیں پاتا۔'' ریما کی آنکھوں میں اداسی چمکنے لگی۔

''ایک بات پوچھوں ریما باجی.....؟'' مرتضیٰ نے سمیٹے برتن وہیں کونے میں رکھے اور ریما کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''ہاں پوچھ۔''

''آپ یہاں کیسے آئیں؟''

''جیسے سب آتے ہیں۔ جیسے تو آیا جیسے بیلا آئی۔''

''مطلب...؟''

''مطلب یہ کہ مرتضیٰ ہم دھتکارے ہوئے لوگ ہیں۔ ہم میں سے کون خوشی سے آتا ہے یہاں۔ ہمیں مجبور کیا جاتا ہے، نکالا جاتا ہے اور پھر ہمارا یہی ایک ٹھکانا بچتا ہے۔'' ریما نے ایک تلخ ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔

''تجھے پتا ہے مرتضیٰ..... کبھی کبھی میرا بہت دل کرتا ہے کہ میں مکمل مرد یا عورت ہوتی۔ میرا بھی ایک گھر ہوتا۔ میں کسی کی بیوی ہوتی یا کسی کا شوہر۔ چھوٹے چھوٹے پیارے بچے ہوتے میرے۔ ان کے مستقبل کی فکر میں لگی رہتی۔'' وہ برش ہاتھ میں پکڑے کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے کھوئے کھوئے انداز میں بولنے لگی اور مرتضیٰ اس کے چہرے پر موجود حسرتوں کو گننے لگا۔

''مرتضیٰ! کبھی کبھی بڑا دل دکھتا ہے۔ رب نے کیوں ظلم کیا اتنا ہم پر۔ کیا تھا جو ہمیں بھی مکمل بنا تا تو آج ہم بھی عزت سے جیتے۔ تجھے پتا ہے یہ ادھورا پن اذیت نہیں ہے۔ اذیت تو لوگوں کا رویہ ہے جو بار بار احساس دلاتا ہے کہ ہم نامکمل ہیں۔ کسی اچھوت کی طرح ہیں۔''

اچانک دروازہ زور سے بجا اور ریما یکدم چپ ہو گئی۔

''میں بھی پتا نہیں کیا باتیں لے بیٹھی۔ جا، جا کر دیکھ کس کو موت پڑی ہے اس وقت۔'' وہ اپنی سابقہ جون میں پلٹ آئی۔ اس کے کنگھی کرتے ہاتھ پھر سے چلنے لگے۔

مرتضیٰ اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھا، اتنی دیر میں دروازہ پھر سے بجا۔

UUNOVELS.COM

''آرہا ہوں۔'' اس نے آواز لگائی اور دروازہ کھول دیا۔
دروازہ کھلتے ہی دو تین پولیس والے تیزی سے اندر گھستے چلے آئے۔
''چل نذیر جلدی سے تلاشی لے۔'' ایک بھاری وجود کے اہلکار نے کرخت آواز میں اپنے ساتھی کو کہا۔ اسی اثنا میں ریما بھی کمرے سے باہر نکل آئی۔
''تلاشی کیوں جی۔ ہم نے کیا کیا ہے؟''
اس نے تنومند اہلکار سے پوچھا۔
''اوئے ہمیں اطلاع ملی ہے کہ تم اجڑے دھندا کرتے ہو اور ساتھ میں منشیات کی سپلائی بھی کرتے ہو۔''
''تو یہ کریں تھانیدار جی۔ پورے محلے سے پوچھ لیں، ریما نے کبھی کوئی نشے والی چیز دیکھی تک نہیں۔ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔''
''اوئے زیادہ ٹرٹر نہ کر۔ ابھی پتا چل جائے گا کہ اطلاع سچی ہے یا جھوٹی۔''
اس پولیس والے نے یہ کہتے ہوئے قدم اندر کی طرف بڑھائے۔
''ہاں اوئے نذیر..... کچھ ملا؟''
اسی شور شرابے میں بیلا کی بھی آنکھ کھل گئی۔ وہ مندی مندی آنکھوں سے انہیں دیکھ کر سب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔
''یہ دیکھیں سر جی۔ یہ پیکٹ ملے ہیں۔''
تھوڑی دیر بعد نذیر نامی شخص دو پیکٹ ہاتھ میں اٹھائے اندرونی کمرے سے برآمد ہوا۔ مرتضیٰ اور ریما ہونقوں کی طرح ان پیکٹوں کو دیکھ رہے تھے جو ہرگز ان کے نہیں تھے۔
تنومند پولیس والے نے ایک پیکٹ کو پھاڑ کر سونگھا اور پھر انگلی کی نوک پر رکھ کر ذرا سا چکھا۔
''ہوں۔ چرس ہے۔ اوئے کب سے کر رہے ہو یہ دھندا..... اور کون کون شامل ہے تم لوگوں کے ساتھ؟ مال کدھر سے لاتے ہو؟'' اس نے ایک ساتھ کئی سوال داغ دیے۔
''قسم لے لیں تھانیدار صاحب، یہ پیکٹ ہمارے نہیں ہیں۔ ہمیں نہیں پتا کہاں سے آئے۔'' ریما نے جواب دیا۔
''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے تھانیدار صاحب۔ ہم نے تو کبھی چرس کی شکل تک نہیں دیکھی۔'' بیلا نے بھی آگے بڑھ کر وضاحت دی
''شوکت! یہ ایسے نہیں مانیں گے۔'' تنومند اہلکار نے ساتھ کھڑے دوسرے ساتھی کی طرف دیکھا۔
''ان کو تھانے لے چلو۔ چار چھتر پڑیں گے تو سارا سچ باہر آجائے گا۔''
پھر ان کے سارے واویلے کے باوجود انہیں پولیس جیپ میں ڈال کر لاک اپ میں پہنچا دیا گیا۔ گرو جی اس سارے سانحے سے بے خبر تھے۔ وہ کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے' شام میں جب وہ گھر پہنچے تو دروازے پر ہی انہیں ساری کارروائی کی خبر مل گئی۔ انہوں نے وہیں سے تھانے کا رخ کیا۔

☆☆☆

لفظوں کے گھاؤ اس نے بہت سہے تھے مگر جسمانی زخم کیسے ہوتے ہیں، یہ اسے آج پتا چلا۔ آج اسے ادراک ہوا کہ جسمانی تکلیف بھی کتنی اذیت ناک چیز ہے۔
لاک اپ میں قید ہوئے انہیں تین گھنٹے بیت چکے تھے اور وہ تین گھنٹے اس کی زندگی کے بدترین لمحات میں سے ایک تھے۔ کسی تھانے میں مجرموں سے سچ اگلوانے کے ضمن میں جو جو پُرتشدد کارروائی ہو سکتی تھی، وہ سب ان کے ساتھ ہوئی۔ اب وہ نیم مردہ حالت میں لاک اپ کی دیوار سے سر لگائے آڑا ترچھا پڑا تھا۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر ریما اور بیلا پڑی کراہ رہی تھیں۔
''نذیر از بان کھولی کہ نہیں ان اجڑوں نے۔''
وہی تنومند اہلکار جو اس تھانے کا انچارج ایس ایچ او لقمان تھا، اس نے کانسٹیبل نذیر سے پوچھا۔
''نہیں سر جی! بڑی ڈھیٹ ہڈی ہیں۔ پر تسی فکر نہ کرو۔ صبح تک کا ٹائم دے دو، دیکھنا کیسے سب یاد آتا ہے ان کو۔''
نذیر نے دانت نکالتے ہوئے اپنی صلاحیتوں کا ڈھنڈورا پیٹا۔
''چل جا عیش کر صبح تک ان کے ساتھ۔ تو بھی کیا یاد کرے گا۔'' ایس ایچ او نے اسے آنکھ مارتے ہوئے گھگی چھوٹ دی۔
اسی اثنا میں گرو جی بھی تھانے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی ایس ایچ او کو سلام جھاڑا۔
''سلام تھانیدار صاحب۔ سنا ہے سرکار میری بچیوں کو تھانے لائے ہیں۔ سرکار کوئی غلطی ہوگئی ہے تو معاف کر دیں۔'' گرو جی ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔ ان کے لہجے میں لجاجت تھی.....
''اچھا تو تم ہو ان کے گرو۔ تو یہ سارا کاروبار تم نے چلایا ہوا ہے۔'' ایس ایچ او نے کڑی نظروں سے گرو جی کو گھورا۔

JUNOVELS.COM

''کونسا کاروبار تھانیدار صاحب۔''

''منشیات کا کاروبار بھولے بادشاہو۔'' ایس ایچ او نے کرسی جھلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں سرکار! کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم ناچ گا کر روٹی کمانے والے لوگ ہیں۔ ہم کبھی اس دھندے میں نہیں پڑے۔'' گرو جی نے اس الزام کی تردید کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اس دھندے میں نہیں پڑے مگر چرس تمہارے گھر سے نکلی ہے۔'' ایس ایچ او نے تیکھی نظروں سے گرو جی کو گھورا۔

''نہیں سرکار! وہ ہماری نہیں ہوگی۔ یہ ضرور کسی کی سازش ہے۔ میں نے اور میری بچیوں نے کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا۔ ہم نے تو کبھی سگریٹ کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔''

''یہ تو ابھی پتا چل جائے گا جب پولیس کی مار پڑے گی کہ کس کس کو ہاتھ لگایا ہے۔''

''اوئے نذیر! اس بیجڑے کو بھی اندر ڈال۔ یہی ان کا سرغنہ ہے۔ اچھا ہے یہ خود آ گیا، اسے تلاش کرنے نہیں جانا پڑا۔''

ایس ایچ او نے کانسٹیبل کو آواز دے کر نیا حکم جاری کیا۔

☆☆☆

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''ریشم۔۔۔۔''

''ہوں۔۔۔۔۔ اچھا نام ہے۔۔۔۔ تمہاری طرح۔''

بیڈ پر نیم دراز ایک بھاری وجود کے شخص نے ہاتھ میں پکڑے جام سے ایک گھونٹ بھرا اور تولتی نظروں سے اس کا ناقدانہ جائزہ لینے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ستائش تھی۔

مرتضیٰ کی سانس رکنے لگی۔ اس کی نظریں زمین میں گڑ کر کچھ کھوجنے لگیں۔ وہ آنے والے لمحات سے باخبر تھا۔ اسے وہ کرنا تھا جو کرنے کا اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ جسم کا سودا کرنے والی کسی عورت کی تکلیف کو وہ آج صحیح معنوں میں محسوس کر سکتا تھا۔۔۔۔

اب تک کی گزری زندگی میں بہت بار اسے لگا کہ شاید اس سے زیادہ مشکل کبھی نہ آئے مگر آج اسے اس حد کی بھی حد نظر آ رہی تھی۔ آج اسے پامالی کا سفر اپنی رضا سے طے کرنا تھا۔

ایس ایچ او نے گرو جی کو بھی ان کے ساتھ لاک اپ میں ڈال دیا تھا۔ گرو جی کی بوڑھی ہڈیاں تھوڑی دیر کی مار کے بعد ہی جواب دے گئیں اور وہ بے جان ہو کر گر پڑے۔ وہ تینوں ان کو سنبھالنے لگے۔ بیلا رو رو کر تھانیدار سے رحم کی بھیک مانگنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد کانسٹیبل نذیر نے ریما کو لاک اپ سے باہر نکالا اور اسے ایس ایچ او کے کمرے میں لے گیا۔ دس منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی تو وہ آ کر خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا ریما؟ کیا کہا تھانیدار نے؟''

تجسس مرتضیٰ کو بھی تھا مگر بیلا زیادہ دیر ریما کی خاموشی برداشت نہیں کر پائی۔ مگر ریما چپ رہی اور سامنے لگی سلاخوں کو گھورتی رہی۔

''کیا ہوا؟ بتاتی کیوں نہیں ہے؟ بتا نا کیا کہا اس مردود نے۔۔۔۔ کیوں بلایا تھا تجھے کمرے میں؟'' بیلا اس کا کندھا ہلا کر پوچھنے لگی۔

''اس نے کہا ہے کہ اگر رہائی چاہیے تو چودھری دلاور کی کوٹھی پر جا کر اس سے معافی مانگو۔ اگر وہ معاف کر دے تو کیس ختم ہو جائے گا۔''

ریما نے لاک اپ کی سلاخوں پر نظریں جمائے جواب دیا۔

''مطلب یہ سب اس کمینے چودھری دلاور نے کروایا ہے۔'' بیلا غصے سے بولی۔

''آہستہ بول، یہ سب اسی کے بندے ہیں۔ اسی کے ٹکوے چاٹتے ہیں۔ جا کر بتا دیں گے اسے کہ تو نے ایسا بولا۔۔۔'' ریما نے نفرت سے آہستہ آواز میں کہا۔ ''پہلے ہی میں اپنی دی گئی گالیوں کی سزا بھگت رہی ہوں۔''

''ہاں تو بتا دے۔ اس سے برا اور کیا کر سکتا ہے وہ مردود۔'' بیلا نے نفرت سے کہا۔

''پھر کیا کہا تو نے؟'' تھوڑی دیر بعد بیلا کو آگے کی بات جاننے کا خیال آیا تو اس نے پوچھا۔

''میں نے کہا مجھے منظور ہے۔'' اس نے بیلا کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔

''پاگل ہے تو۔ کیوں کہا ایسے۔ کوئی ضرورت نہیں اس حرامزادے سے معافی مانگنے کی۔ اس سے معافی کا مطلب جانتی ہے نا۔''

''ہاں جانتی ہوں اور تو بھی جانتی ہے کہ نہ مانگنے سے کیا ہوگا۔ مجھے چودھری دلاور کے پاس جانا ہی ہوگا ورنہ گرو جی تو شاید صبح تک بھی نہ بچیں۔''

ریما نے دیوار سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں اور

UUNOVELS.COM

مرتضیٰ اور بیلا اسے تاسف سے دیکھتے رہ گئے۔

''اور صرف مجھے ہی نہیں تم دونوں کو بھی ساتھ جانا ہوگا۔'' تھوڑی دیر بعد اس نے ان دونوں کی سماعتوں پر بم پھوڑا۔

''کیا..... مگر ہم سب کو کیوں؟ یہ تو نری بے غیرتی ہے اس خبیث کی۔'' بیلا پھٹ پڑی۔

''مجھے معاف کردے مرتضیٰ میری وجہ سے آج تو بھی مصیبت میں ہے۔'' شرمندگی سے بھری نظریں اٹھا کر اس نے مرتضیٰ کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ ''تو بھی مجھے معاف کر دے بیلا..... یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔'' اب کی بار وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مرتضیٰ سپاٹ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب بات اس کے یا ریما کے اختیار میں نہیں رہی۔ چودھری دلاور یا ایس ایچ او جو چاہتے ہیں اب وہی ہوگا۔

گروجی کو بچانے کے لیے وہ یہ سب اب کریں یا ان کی موت کے بعد خود کو بچانے کے لیے کریں..... مگر ہر صورت میں سب کرنا ہی پڑے گا۔

دس سال قبل کا منظر اس کی یادداشت میں سرسرانے لگا۔ چاچا قدیر کے غلیظ ہاتھوں کا لمس اسے پھر سے اپنے وجود پر محسوس ہونے لگا۔ وہ بے جان سا ہو کر لاک اپ کے ٹھنڈے اور گندے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

☆☆☆

رات گئے پولیس کی گاڑی ان تینوں کو چودھری دلاور کی کوٹھی پر چھوڑ آئی۔

چودھری اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ محفل سجائے بیٹھا تھا۔ اس نے فاتحانہ اور جتاتی ہوئی نظروں سے ریما کی طرف دیکھا۔

''آؤ ریما آؤ..... سنا ہے بڑا زبردست ڈانس کرتی ہو۔ ذرا ہم بھی تو دیکھیں۔ آہاہ..... آج تو تیرے ساتھ دو اور تتلیاں بھی ہیں۔'' اس نے بیلا اور مرتضیٰ کو حریصانہ نظروں سے دیکھا۔

''واہ چودھری! ایک نہ شد تین شد۔ قسمت کا دھنی ہے تو تو۔'' اس کے ساتھ بیٹھا شخص مکروہ ہنسی ہنسا۔

''یہ تمہاری قسمت کا رزق چل کر آیا ہے۔ آج میرے مہمان بنو اور خوب عیش کرو۔'' چودھری دلاور نے اپنے دوستوں کو آفر کی اور وہ سب قہقہے لگانے لگے۔

وہ پوری رات ان تینوں نے چودھری دلاور اور اس کے دوستوں کا دل بہلانے میں گزاری۔

انہی دوستوں میں سے ایک رانا مشتاق بھی تھا جس نے رنگین رات کے انعام میں صبح مرتضیٰ کو ایک کارڈ دے کر کہا۔

''اپنے آپ کو چند پیسوں میں مت بیچو۔ تم باقی لڑکوں سے بہت الگ ہو۔ ذرا سا پالش ہو کر کہاں سے کہاں پہنچ جاؤ گے۔ اس پتے پر چلے جانا، وہاں تمہیں اس کام کا کئی گنا معاوضہ ملے گا۔''

اور اس نے بغیر کچھ کہے چپ چاپ کارڈ رکھ لیا۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ گروجی کے ساتھ گھر واپس آ گئے۔ مرتضیٰ دیر تک بستر پر پڑا چھت کے شہتیروں کو گھورتا رہا۔

سچ کہا تھا ریما نے..... وہ بھیڑیوں کے جھنڈ میں پھنسا ہے۔ اب شاید چاہ کر بھی نہ نکل سکے۔ جس چیز سے بچانے کے لیے ثریا نے اسے ہمیشہ ساتھ ساتھ رکھا، دربدری جھیلی..... وہ تو پھر بھی اس کا مقدر بن گئی۔

اسے سمجھ نہ آیا کس سے شکوہ کرے۔ ریما سے جو خود اس تکلیف سے گزر رہی تھی۔ حالات سے جنہوں نے ایسا رخ اختیار کیا تھا۔ زینب سے جس کی وجہ سے وہ یہاں تک آ گیا تھا یا رب سے جس نے اسے اس طرح کا بنا کر دنیا میں بھیجا اور اسے ایسا بنا بھی دیا تو ایسی پتھر دل مخلوق کیوں بنائی؟ انسان کو حیوان سے بدتر کیوں کر دیا؟

کل سے ان چاروں میں سے کسی نے بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ بیلا نے ہمت مجتمع کر کے کھانا بنایا اور گروجی اور ریما کو کھلایا۔ اسے بھی اس نے زبردستی کھانے پر راضی کیا مگر وہ بمشکل دو نوالے ہی کھا پایا۔ عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ اسے لگا کچھ بھی اندر گیا تو سب باہر آ جائے گا۔

گزشتہ رات کے مناظر اس کی آنکھوں کے پردے سے ہٹنے کو تیار ہی نہ تھے۔ وہ اس دن جہنم کدہ سے نکل آئے تھے۔

مگر اس کے بعد کی کئی راتیں انہوں نے کبھی چودھری دلاور اور کبھی ایس ایچ او کی خلوت میں گزاریں۔

وہ کام جس سے ریما بچتی آئی تھی، وہ کام جس کا مرتضیٰ نے کرنے کا کبھی نہیں سوچا تھا..... وہ اب انہیں اکثر کرنا پڑتا تھا۔ ایس ایچ او کے ہنٹروں کے زخم روح کی پامالی پر بھاری پڑ گئے تھے۔

اور پھر ایک رات ریما چودھری کے بلاوے پر گئی تو واپس نہیں آئی۔ وہ اور بیلا کتنی بار چودھری دلاور کی کوٹھی پر اس کا پتا کرنے گئے مگر ہر بار یہی جواب ملا کہ وہ یہاں آئی ہی نہیں۔

انہوں نے ایس ایچ او کی بھی کتنی ہی منتیں کیں کہ وہ

JUNOVELS.COM

ریما کو ڈھونڈیں مگر اس کا یہی جواب تھا۔

''بھاگ گئی ہوگی اپنے کسی یار کے ساتھ۔ آجائے گی خود ہی واپس دو چار دن رہ کر۔ تم ہیجڑوں کو کسی نے پکڑ کر یا مار کر کیا کر لینا ہے۔''

اور تین دن بعد گندے نالے سے اس کی تار تار زخمی اور کٹی پھٹی لاش ملی۔

اس رات وہ دونوں گرو جی کے گلے لگ کر بہت روئے۔ اس رات گلی کے کتے بھی رات گئے تک انسانیت کی موت پر بین کرتے رہے مگر انسان خاموش رہے۔

صبح تک گرو جی نے اپنا مختصر سامان باندھ کر وہاں سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اب وہ شہر رہنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ بیلا بھی ان کے ساتھ جا رہی تھی اور مرتضیٰ کیسے جا سکتا تھا۔ اس کا تو سب کچھ اسی شہر میں تھا مگر وہ ایک بار پھر سے بے گھر ہونے والا تھا۔

☆☆☆

وہ گھر آیا تو اماں کو بخار میں تپتے پایا۔ نقاہت کے باعث وہ آنکھیں بھی نہیں کھول پا رہی تھیں۔

''اماں کو کیا ہوا ہے؟''

بہت عرصے بعد مرتضیٰ نے زینب سے کوئی بات کی تھی۔ چپ کی ایک دیوار دونوں کے بیچ کب سے حائل تھی جسے عبور کرنے کی نہ تو کبھی زینب نے کوشش کی، نہ مرتضیٰ کی ہمت ہوئی۔ مگر آج ثریا کو بستر سے لگا دیکھ کر وہ بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

زینب اسے آج گھر پر ہی مل گئی تھی۔ اس کی شادی کے بعد وہ پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی۔ اس کا لباس اس کی خوشحال زندگی کی عکاسی کر رہا تھا اور اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ کتنا خوش ہے۔

مرتضیٰ کے دل سے اس کی دائمی خوشیوں کی دعا نکلی۔

''بار بار بخار ہو رہا تھا اماں کو۔ گردے میں بھی درد تھا۔ ڈاکٹر کو چیک کروایا تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اماں کے گردے میں پتھری ہے۔ آپریشن کرنا ہوگا۔'' اس نے اماں کی خرابی طبیعت کی وجہ بتائی۔

''میں پیسوں کا بندوبست کر دوں گا۔ تم کسی اچھے اسپتال سے اماں کا علاج کروانا۔''

وہ اثبات میں سر ہلا کر خاموش بیٹھی رہی پھر کچھ دیر بعد بولی۔ ''مرتضیٰ! تجھ سے ایک بات کرنی تھی۔''

''بول.....؟''

''تُو یہاں مت آیا کر۔'' وہ اتنا بول کر رک گئی۔ اس کی بات پر مرتضیٰ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''میرا بھرا پرا سسرال ہے۔ کوئی بھی کسی بھی وقت اماں سے ملنے آ سکتا ہے۔ اگر کسی نے تجھے یہاں دیکھ لیا تو میں کیا بتاؤں گی۔'' اس نے آنکھیں چرا کر اپنی بات کی وضاحت کی۔

''اگر کسی کو بھی تمہارے بارے میں پتا چل گیا تو میرا بسا بسایا گھر اجڑ جائے گا۔ اس لیے میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں تو یہاں مت آیا کر۔'' اب کی بار اس کے لہجے میں لجاجت در آئی اور مرتضیٰ اسے بس دیکھتا رہ گیا۔

اس نے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ وہ کیسا ہے؟ کس حال میں ہے؟ کیسے جی رہا ہے؟ کہاں رہ رہا ہے؟ ایک نظر یہ تک نہیں دیکھا کہ اس کے چہرے پر چوٹوں کے کتنے نشان ہیں۔ ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ زندگی کی ٹھوکریں اسے کس شدت سے لگ رہی ہیں۔

اسے آج بھی بس اپنی زندگی، اپنا گھر عزیز تھا اور آج بھی مرتضیٰ کو زینب کی خوشی عزیز تھی۔ اس نے پہلے اس کی بات نہیں ٹالی تھی تو اب کیسے ٹال دیتا۔

''ٹھیک ہے اب نہیں آؤں گا۔''

وہ بس اتنا کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

اب ایک بار پھر سے وہ دربدر تھا۔ وہ گرو جی کے ساتھ نہیں گیا تھا۔ یہ سوچ کر گھر آ گیا کہ اب اماں کے ساتھ رہے گا مگر زینب نے ایک بار پھر اسے جانے کا کہہ دیا تھا۔

اب وہ گرو جی کے ڈیرے پر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ گرو جی جاتے وقت اپنا سب سامان لے گئے تھے اور مکان کسی اور کے حوالے کر گئے تھے۔ ایک بار پھر سے اس کے پاس کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

اس نے جیب سے رانا مشتاق کا دیا ہوا.... کارڈ نکالا۔ ''ٹیلنٹ میک'' نامی ادارے کا پتا درج تھا۔ وہ اس ادارے سے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا ہے اور وہاں کیا ہوتا ہے مگر اسے اتنا ضرور معلوم تھا کہ اس سے وہاں وہی کام لیا جانا تھا جو وہ چودھری دلاور کی کوٹھی میں پولیس کی مار کے بعد کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔

جو اب تک مجبوری میں کیا وہ اب اسے رضامندی سے کرنا ہوگا۔

گرو جی کے ڈیرے نے اسے ایک نیا نام، نئی شناخت دی تھی۔ اسے ریشم کے قالب میں ڈھالا تھا۔ اب وہ ایک اور مکروہ کام کا آغاز کرنے جا رہا تھا تو اسے ایک اور

UUNOVELS.COM

نیا نام چاہیے تھا۔

سو اس نے اب ریشم سے "احمد حسن" تک کا سفر شروع کر دیا۔

"ٹیلنٹ میک" کے آفس میں کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد بالآخر ان کی من پسند تصاویر کھینچ لی گئیں جنہیں اس کے پورٹ فولیو میں لگا کر گاہکوں کو بھجوانا تھا۔ پھر جو اسے بک کرتا، اس کے آرڈر کا تیس فیصد معاوضہ مرتضیٰ کے اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتا۔

بظاہر اس ادارے میں نئے ٹیلنٹ کو شوبز کی دنیا میں متعارف کرایا جاتا تھا۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں ماڈلنگ اور اداکاری سیکھنے کے لیے آتے تھے مگر پسِ پردہ امراء کو ان کی پسند کی عیاشی فراہم کی جاتی تھی۔

ابھی اس کی باقاعدہ ٹریننگ ہونا تھی جس میں اسے سکھایا جاتا کہ اسے کسٹمر کو کیسے ڈیل کرنا ہے۔ کس انداز سے بات کرنی ہے۔ کیسے اپنے آپ کو پیش کرنا ہے۔

سب کام منظم طریقے سے انجام دیا جا رہا تھا۔ اس دفتر میں بیٹھ کر یہ دھندا نہیں تھا، آرٹ تھا، بزنس تھا، ٹیلنٹ تھا اور وہ اپنا فن بیچنے آیا تھا۔

ایک ادھورے انسان نے مکمل لوگوں کی تشنہ خواہشات کی تکمیل کرنی تھی۔ قوم لوط کے پیروکار نفس کا بازار سجائے بیٹھے تھے اور وہ اب "بکنے" کو تیار تھا۔

☆☆☆

رانا مشتاق نے ٹھیک کہا تھا۔ ہیجڑوں کے ڈیرے پر جس کام کی کمائی چند سو روپے تھی، وہ ایک منظم ادارے میں ہزاروں تھی۔ اس نے بہت جلد ٹریننگ مکمل کر لی تھی۔ اگرچہ یہ سب اس کے لیے بہت مشکل تھا مگر وہ سب مشکل تب تب آسان لگنے لگی جب جب اسے یاد آیا کہ اماں بیمار ہے اور اسے جلد از جلد زیادہ رقم اکٹھی کرنی ہے تاکہ ان کا علاج ہو سکے۔

اس ٹریننگ کو جلد مکمل کرنے میں اس کی ادھوری تعلیم نے بھی بہت ساتھ دیا۔

اس کے ساتھ یہاں اور بھی کئی نوعمر لڑکے تھے۔ اسے شدید حیرت کا جھٹکا لگا جب اسے معلوم ہوا کہ ان میں سے کئی خواجہ سرا نہیں تھے بلکہ مرد تھے۔ کچھ کو مالی مجبوریاں یہاں کھینچ لائی تھیں اور کئی ایسے تھے جو شوق سے اس فیلڈ میں آئے تھے۔ حیرتوں کا ایک جہان تھا جو اب مرتضیٰ پر کھلنے جا رہا تھا۔

بہت جلد وہ پسندیدہ "بوائز" کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ چند کسٹمرز سے حاصل کردہ آمدن اس نے ایک رات جا کر ثریا کو پکڑا دی۔ ثریا کی طبیعت اس بار قدرے بہتر تھی۔

"اتنے سارے پیسے کہاں سے آئے تیرے پاس؟"

اتنی رقم مرتضیٰ کے ہاتھوں میں دیکھ کر وہ پوچھے بنا نہ رہ سکیں۔

"اماں، نئی نوکری مل گئی ہے۔ کچھ صاحب سے ایڈوانس بھی لیا ہے۔ بس اب تو اپنا علاج کروا، رقم کی فکر نہ کر۔"

اتنے عرصے میں اسے ثریا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سلیقے سے جھوٹ بولنا آ گیا تھا۔

ثریا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس کا بیٹا آج واقعی بیٹا بن کر اس کا خیال رکھنے کے قابل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

لوگوں کے ہجوم کے بیچ وہ کسی اجنبی کی طرح کھڑا تھا۔ کہیں لوگ دلاسا دے رہے تھے تو کسی کے رونے کی آواز ماحول کی سوگواری میں اور بھی اضافہ کر رہی تھی۔

اور اس سارے ہجوم میں وہ چپ چاپ کھڑا تھا۔ بین اس کے دل میں بھی جاری تھا۔ خشک آنکھوں کے پیچھے آنسوؤں کی ندی بہہ رہی تھی مگر وہاں اس کا غم دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

اس کا دل چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ لوگوں کو چیخ چیخ کر بتائے کہ اس کی دنیا اجڑ گئی ہے۔ وہ آج بے سہارا ہو گیا ہے۔ بالکل اکیلا رہ گیا ہے۔

اس کی ماں جس نے ساری دنیا سے لڑ کر اسے سینے سے لگایا، پناہ دی..... پیار دیا، آج وہ بھی اسے چھوڑ کر چلی گئی۔

اور وہ اتنا بے بس تھا کہ اس کی موت پر رونے تک کا اختیار بھی نہیں رکھتا تھا۔

اس نے دور کھڑی زینب پر ایک نظر ڈالی۔ اسی پل زینب نے بھی اسے دیکھ لیا مگر وہ نظریں چرا کر آنسو صاف کرنے لگی۔

مرتضیٰ سمجھ گیا کہ وہ آج بھی نہیں چاہتی کہ وہ یہاں نظر آئے۔ اسے آج بھی ماں کے جانے پر رونے کے لیے بھائی کا کندھا نہیں چاہیے تھا بلکہ بھرم درکار تھا۔

اتنے سال ماں سے دور رہ کر اس نے اس کا بھرم برقرار رکھا تھا تو آج کیسے توڑ دیتا؟

اب وہ وہاں مزید نہیں رک سکتا تھا۔ رک کر کرتا بھی کیا؟ جو رشتے بچے تھے سب جانے والی کے ساتھ آج ختم ہو گئے تھے۔ اب ان رشتوں کی باقیات بھی جلد ہی دفن ہونے والی تھیں۔

UUNOVELS.COM

اماں چلی گئی تھی۔ اب کیا فرق پڑتا کہ وہ اسے آخری بار بھی نہ دیکھ پاتا تو۔

اس نے دور سے ایک نظر ماں کے زندگی سے عاری وجود پر ڈالی اور واپس مڑ گیا۔ اس بار اس نے کہاں جانا تھا، وہ پھر سے نہیں جانتا تھا۔ بس یہ جانتا تھا کہ اس بار واپسی کا کوئی در کھلا چھوڑ کر نہیں جا رہا۔

☆☆☆

زینب نے اس دن آخری بار مرتضیٰ کو دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ اسے پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ بغیر کسی گلے شکوے کے وہ چلا گیا تھا۔ اسے بھی قلق تھا کہ وہ اماں کا آخری بار چہرہ تک نہیں دیکھ پایا مگر شاید یہی ان دونوں کے حق میں بہتر تھا۔ مرتضیٰ اماں کو دیکھ کر روتا تو وہ کسی کو کیا بتاتی کہ یہ کون اجنبی ہے جو اس کی ماں کے مرنے پر اتنا رو رہا ہے۔

اماں چلی گئیں، اس کے ساتھ مرتضیٰ بھی ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے چلا گیا۔ اس کا بھرم رہ گیا۔ اب اسے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے تھا۔

زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی۔ مدثر اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اپنی ملنسار اور خدمت گزار طبیعت سے اس نے ساس سسر کے دل میں بھی گھر کر لیا تھا اور اب تو وہ گھر بھر کی لاڈلی بن گئی تھی۔ وہ اس گھر کے اکلوتے بیٹے کی اولاد کو جنم دینے جا رہی تھی۔

زندگی یکدم بہت خوبصورت ہو گئی تھی۔ وقت گزرے ایام کی سب تکلیفوں کا مداوا کر رہا تھا۔ وہ رب کی مشکر تھی۔ اب وقت آگے کو بڑھ رہا تھا، سو اس نے بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی غلطی نہیں کی۔

☆☆☆

کہتے ہیں وقت خود کو دہراتا ہے۔ کہانی نئے کرداروں کے ساتھ پھر سے جنم لیتی ہے اور نفع کے متلاشی کبھی کبھی گھاٹے کی گلیوں میں بھی بھٹک جاتے ہیں۔ ایسا ہی زینب کے ساتھ بھی ہوا۔

وہ جو ماضی کو بہت پیچھے چھوڑ کر بہت آگے بڑھ آئی تھی، بس ایک ہی ٹھوکر سے واپس اسی مقام پر آ گئی۔

وہ جو ماں بننے کی خوشی سے سرشار پاؤں زمین پر نہیں ٹکا رہی تھی، اس انکشاف سے ہل کر رہ گئی کہ اب پاؤں تلے زمین ہی نہیں رہی۔ ماں بننے کے غرور میں جیتے ابھی وقت ہی کتنا گزرا تھا کہ نامکمل بچے کے انکشاف نے اسے مار دیا۔

وہ آج وہیں تھی جہاں اکیس سال پہلے ثریا تھی۔ آج اسے ثریا کی تکلیف سمجھ آ رہی تھی۔ آج اسے مرتضیٰ کا درد بھی محسوس ہو رہا تھا مگر اب مکافات کا پہیا گھوم گیا تھا شاید۔

اب اس کے اختیار میں کچھ نہیں رہا تھا۔ کاش کہ وہ وقت میں پیچھے جا کر سب بدل سکتی۔ بس ایک کاش ----- کتنے دن وہ اس ننھی جان کو خود سے لگائے پریشان پھرتی رہی کہ مدثر کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا۔

مگر کب تک؟ آخر ایک دن وہ جان ہی گیا۔ اسے جاننا ہی تھا اور مدثر نے زینب کے ساتھ وہی کیا جو کبھی نور حسن نے ثریا کے ساتھ کیا تھا۔

"یہ تمہاری اولاد ہے..... اس کو اس طرح کیوں دھتکار رہے ہو جیسے کوئی جانور ہو یہ۔"

"یہ غلاظت میری اولاد نہیں ہے۔ پہلے بتا دیتیں تو اسے اسپتال میں ہی کہیں چھوڑ آتا۔ مگر اب بھی دیر نہیں ہوئی۔ اسے دو، میں اب چھوڑ آؤں گا۔" ایک دنیادار شخص ایک بار پھر اپنی اولاد کو دھتکار رہا تھا۔

"میں اسے خود دے آؤں گی کسی دارالامان میں۔" اس نے مدثر کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

"ٹھیک ہے کل تک کا وقت ہے۔ جہاں چھوڑ کر آنا ہے چھوڑ آؤ۔ جہاں بھیجنا ہے بھیج دو۔ پرسوں مجھے یہ اس گھر میں نظر نہ آئے۔ ورنہ اس کے ساتھ ساتھ تم بھی باہر جاؤ گی۔" اس نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

اس کی نظروں میں حقارت تھی، تنفر تھا۔ اپنے ہی خون کے لیے۔

☆☆☆

زینب نے یہاں آنے سے پہلے تمام تر ممکنات سوچ لیے تھے۔ اسے اپنے لخت جگر کو کہیں سیڑھیوں پر چھوڑنا ہے، کسی گروپ کی شکل میں بیٹھی فیملی کے پاس چپکے سے رکھ آنا ہے یا کسی کی منت کر کے اس کی رضامندی سے اس کے سپرد کرنا ہے..... ان میں سے کوئی بھی آپشن ہوتا، وہ یہ بات اچھے سے جانتی تھی کہ وہ تمام تر چہرے اس کے لیے اتنے ہی انجان ہوں گے جتنا اس کا چہرہ ان میں سے کسی کے لیے ہوتا۔

اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہاں اسے مرتضیٰ بھی مل سکتا ہے وہ بھی اس حال میں۔ کسی دربار پر رقص میں تیزی سے اٹھتے پیروں کے ساتھ، ایک چوغے میں ملبوس، تمام تر بے نیازی اور خوف سے عاری چہرہ لیے۔

اسے مرتضیٰ کو پہچاننے میں دقت نہیں ہوئی مگر اس کے چہرے کو تلاشنے میں وقت لگا۔ بے شک نقوش وہی تھے مگر

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

یہ وہ چہرہ نہیں تھا۔ ایک نامکمل مرد کا چہرہ نہیں تھا۔ کسی خواجہ سرا کا چہرہ نہیں تھا اور نہ ہی کسی بے شناخت اور ٹھکرائے ہوئے وجود کا چہرہ تھا۔

آج اس چہرے پر بے نیازی تھی، بے خوفی تھی، تقدس تھا، پہچان تھی۔

زینب کو لمحہ لگا فیصلہ کرنے میں۔ وہ فیصلہ جو سابقہ ایک سو آٹھ دنوں میں نہیں کر پا رہی تھی، وہ فیصلہ جو گزشتہ آٹھ گھنٹے اور چودہ منٹ میں متزلزل رہا، وہ اس نے ایک پل میں کر لیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور مرتضیٰ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

مرتضیٰ کا جھومتا وجود کسی اور کی موجودگی کے احساس سے ٹھہر گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

ان نظروں میں نہ پہچان تھی، نہ ہی بیگانگی۔ بس ٹھہراؤ تھا۔ وہ خاموشی سے کھڑا اسے دیکھنے لگا۔

''کیسے ہو مرتضیٰ؟'' وہ خاموش رہا۔

''میں زینب..... تمہاری بہن۔'' اسے لگا شاید وہ پہچان نہیں پایا اسی لیے خاموش ہے۔

''جانتا ہوں۔'' دو لفظ ادا ہوئے مگر نہ آنکھوں میں پہچان ابھری تھی، نہ چہرے پر اپنایت۔

تب زینب کو یاد آیا کہ وہ اس کی بہن تھی ہی کب۔ بس وہی اس کا بھائی تھا جسے اس نے دھتکار کر دور کر دیا تھا۔ شرمندگی سے اس کی نظریں جھک گئیں۔

''مجھے معاف کر دو مرتضیٰ۔ میں نے بہت غلط کیا تمہارے ساتھ۔''

''میں نے اپنی بدقسمتی کا ذمے دار تمہیں ٹھہرایا۔''

''تمہیں اماں سے ملنے سے روکا۔ ان کو آخری بار دیکھنے بھی نہیں دیا۔''

''تمہیں دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کیا۔''

''تمہیں بھیڑیوں کی دنیا میں اکیلے نکل جانے پر مجبور کیا۔''

وہ بولتی جا رہی تھی اور مرتضیٰ خاموش کھڑا تھا بالکل خاموش۔ جذبات سے عاری چہرہ لیے مگر اندر خاموشی نہیں طوفان مچا تھا۔ ایک ایک اذیت ناک منظر نگاہوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

''یہ دیکھو، اللہ نے مجھے میرے کیے کی سزا دے دی۔ مجھے تمہاری بددعا لگ گئی مرتضیٰ۔ مجھے بھی اللہ نے نامکمل اولاد دے دی۔'' وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مرتضیٰ نے اب ایک نظر اٹھا کر اس کی گود میں سوئے بچے پر ڈالی۔

'تو اب بھی زینب تمہارے لیے میں اور مجھ جیسا وجود سزا ہے، بددعا ہے؟' اس نے تلخی سے سوچا۔

''مدثر کو یہ بچہ نہیں چاہیے۔ اس نے بھی اسے دھتکار دیا جیسے ابا نے تمہیں دھتکارا تھا۔'' اس کے آنسوؤں میں روانی آنے لگی۔

'ایسا ہی ہونا تھا۔ ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔' مرتضیٰ نے سوچا۔

''میں اسے یہاں چھوڑنے آئی تھی۔ مدثر کو یہ ادھورا بچہ نہیں چاہیے۔ اگر میں نے اسے نہیں چھوڑا تو وہ مجھے چھوڑ دے گا۔'' اس کے آنسو ہچکیوں کے ساتھ بہنے لگے۔

'تو اب بھی زینب تمہیں اپنا گھر اپنا شوہر عزیز ہے؟ نامکمل اولاد تمہیں بھی نہیں چاہیے۔ ہر ایک ماں ظرف میں ثریا نہیں بن پاتی۔' مرتضیٰ نے تلخی سے سوچا۔

''مرتضیٰ تم اسے رکھ لو۔ اسے پال لو۔ یہ تمہارے پاس رہے گا تو مجھے تسلی رہے گی کہ یہ محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ تم اسے لے لو گے نا؟'' اس نے آس بھری نظروں سے مرتضیٰ کو دیکھا۔

اور مرتضیٰ نے اس تمام عرصے میں پہلی بار اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ آج تک اس سے مانگتی آئی تھی مگر آج پہلی بار کچھ دینے آئی تھی۔ وہ بھلا کیسے انکار کرتا؟

اس نے ہاتھ بڑھا کر بچہ اس سے لے لیا۔ زینب کی آنکھوں میں تشکر امڈ آیا۔

''میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ میں یہاں تم سے ملنے آیا کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ تم میرے بچے کا بہت خیال رکھو گے۔''

وہ خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہتی جا رہی تھی اور مرتضیٰ اب بھی چپ تھا۔

اس نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے جواب دینے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ زینب کو جو چاہیے تھا، وہ اسے مل چکا تھا۔ وہ تھوڑی دیر اور بولتی رہی پھر جلد دوبارہ آنے کا کہہ کر وہاں سے پلٹ گئی۔

جاتے وقت وہ کتنی ہی بار مڑ مڑ کر دیکھتی رہی۔ مرتضیٰ اب تک وہیں کھڑا تھا۔ زینب کے جانے کے بعد اس نے کمبل میں لپٹے بچے کو پہلی بار غور سے دیکھا۔ فرشتوں کی سی معصومیت لیے وہ سوتے میں بھی مسکرا رہا تھا۔

'اسے کتنی کٹھن زندگی ملی ہے، اس معصوم کو خبر تک نہیں ہے۔'

مرتضیٰ نے ایک لمحے کو سوچا پھر اندر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

اسے ایک نامکمل وجود کو مکمل کرنا تھا۔

⌘⌘⌘

UUNOVELS.COM

اللہ کے ایک نیک فطرت اور برگزیدہ بندے کا مقام

جب کسی دل میں عبادتِ الٰہی کا شوق اور رمزِ کائنات کو سمجھنے کا ذوق ہو تو اس دل کی تڑپ اسے جگہ جگہ لیے پھرتی ہے اور جب تک یہ پیاس بجھ نہ جائے اسے بیٹھنے نہیں دیتی... حسین بن منصور حلاج کا شوق اور ذوق بھی انہیں مسلسل سفر میں رکھے ہوئے تھا... جہاں بھی موقع ملا تصوف کے اسرار و رموز سیکھتے رہے مگر ان کی وحشت انہیں کہیں بھی سکون سے رہنے نہ دیتی۔ ہمیشہ ریاضتوں اور مجاہدوں میں مشغول رہتے۔

حضرت حسین بن منصور حلاجؒ

رضوانہ ساجد

دوسرا حصہ

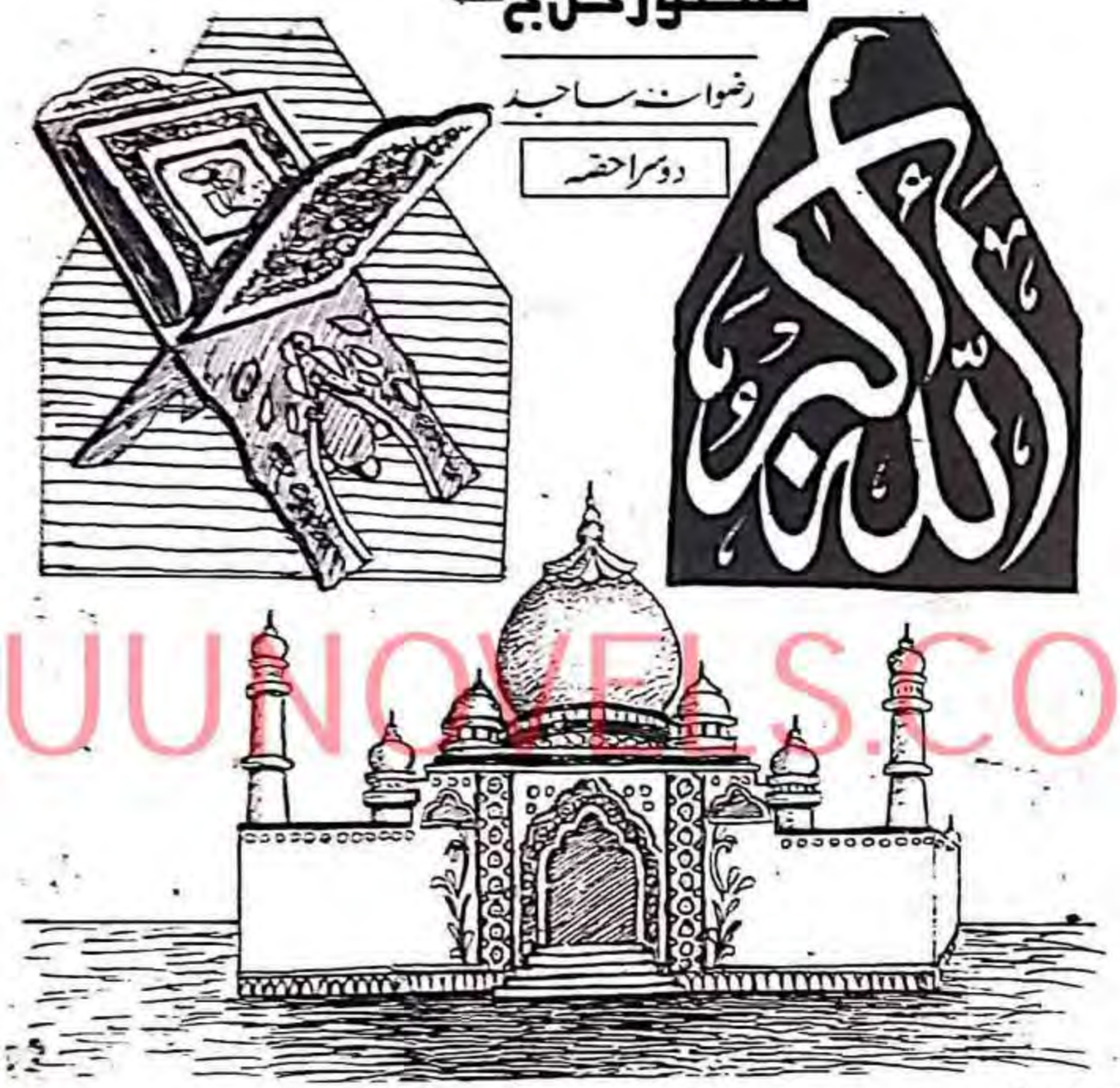

UUNOVELS.COM

"پھر شاید انہیں قرار آجائے۔"

آپ نے صوفیانہ لباس ترک کر کے اہلِ دنیا کا لباس اختیار کر لیا۔ مشائخ کی صحبت بھی ترک کر دی اور اہلِ دنیا کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا۔

"عشق ہر حال میں ہے عشقِ بلاخیز مرا....."

لوگوں کو اب بھی چین نہ آتا تھا۔ کچھ دنوں تک تو لوگوں نے اس تبدیلی کو حیرت کی نظر سے دیکھا اور پھر حاسدوں نے اسے بھی ڈھونگ قرار دیا۔

''منصور ڈھونگی ہے اور اب اس نے نیا بہروپ اختیار کیا ہے۔''

عقیدت مند آپ کی اس حالت کو بھی کسی کرامت سے تعبیر کر رہے تھے اور اس سلسلے میں مبالغہ آمیز باتیں کرتے پھر رہے تھے۔

منصورؒ کا عشق اب اس منزل پر تھا کہ بسمل کو تڑپنے کے لیے گنجائش چاہیے تھی اور یہاں یہ حال کہ عقیدت مندوں کا ہجوم آپ کو گھیرے ہوئے تھا۔ آپ نے اسی میں عافیت جانی کہ یہاں سے بھی چلے جائیں۔ انہوں نے ایک رات خاموشی سے تستر چھوڑ دیا۔ اس مرتبہ وہ اپنی زوجہ اور بیٹے احمد کو بھی ساتھ لے کر نہیں گئے بلکہ انہیں بتایا تک نہیں کہ ارادہ کدھر کا ہے۔ اہلِ تستر کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک کہاں گئی۔

آپ کے صاحبزادے احمد بن حسین کی زبانی یہ روایت تاریخ میں ملتی ہے۔

''ہمارے والد پانچ سال تک ہم سے دور رہے۔ بس لوگوں کی زبانی خبریں ملتی رہتی تھیں کہ میرے والد خراسان تشریف لے گئے ہیں۔ پھر کہنے والوں نے کہا کہ وہ ماوراالنہر کے علاقے میں دیکھے گئے ہیں۔ پھر کچھ عرصے بعد یہ خبر ملی کہ وہ سجستان کی سیاحت میں مصروف ہیں۔ ایک دن معلوم ہوا کہ وہ ایران میں موجود ہیں۔ پرانی روش پر لوٹ آئے ہیں۔ مجالس منعقد کرتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔''

ایران میں ان کی شہرت اتنی بڑھی کہ ''عبداللہ زاہد'' کے لقب سے پکارے جانے لگے۔ ایران میں قیام کے دوران انہوں نے چند کتابیں بھی تصنیف کیں۔

اسی زمانے میں وہ ''اہواز'' چلے گئے۔ انہوں نے زوجہ اور صاحبزادے کو بھی اہواز بلا لیا۔ یہاں بھی ان کی مجالس کی شان اور مقبولیت قابلِ دید تھی۔

اہواز والوں نے انہیں ''حلاج الاسرار'' کے لقب سے یاد کرنا شروع کر دیا کیونکہ وہ لوگوں کے دلوں کی باتیں بتا دیا کرتے تھے۔

ان کی بے قراری نے انہیں یہاں بھی نہیں رہنے دیا۔ وہ دوبارہ بصرہ تشریف لے گئے۔ یہاں مختصر قیام کے بعد آپ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔

اس بار ان کا حال عجیب تھا۔ وہ ایک گدڑی کے ساتھ بہت اونچا پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ عقیدت مندوں کی بھیڑ ان کے ساتھ چل رہی تھی۔

حضرت ابو یعقوب بن اسحاق نہر جوریؒ اس دور کے نہایت عظیم المرتبت بزرگ گزرے ہیں۔ حضرت عمرو بن عثمانؒ کے فیض یافتہ تھے۔ حضرت عمرو بن عثمان مکیؒ چونکہ ان کے استادِ مکرم تھے اور حضرت عثمان مکیؒ، حضرت منصور سے ناراض تھے اس لیے حضرت ابو یعقوب بھی حضرت منصور کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے جو یہ گرم بازاری دیکھی تو شدت سے مخالفت پر اتر آئے۔ جہاں بھیڑ دیکھتے وہاں پہنچ جاتے اور لوگوں سے مخاطب ہوتے۔

''تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ ایک شعبدہ باز کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہو۔ منصور کا ساتھ چھوڑ دو، ورنہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ گے۔''

لوگوں پر تو ان باتوں کا کیا اثر ہوتا، بعض علماء ان کی باتوں میں آ گئے اور اپنے مواعظ میں حضرت منصورؒ کے خلاف باتیں کرنے لگے۔

حضرت منصور حلاجؒ اپنے مخالفین سے بھی تنگ تھے اور عقیدت مندوں سے بھی۔ جب انہیں یہاں بھی ان دونوں گروہوں سے سابقہ ہوا تو ایک ماہ کے مختصر قیام کے بعد مکہ مکرمہ چھوڑ دیا۔ پہلے ''اہواز'' تشریف لائے اور اہل و عیال کو ساتھ لے کر بغداد کی طرف روانہ ہو گئے۔

بغداد میں وہ ایک سال رہے لیکن حضرت جنید بغدادیؒ سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ خانقاہِ بغداد یہ سے ایک مرتبہ اٹھے تو دوبارہ پھر نہیں گئے۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت جنید بغدادیؒ اپنے اس شاگرد سے ناراض تھے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حضرت منصور کے خلاف کوئی بات کہی ہو۔ انہیں شعبدہ باز و ساحر جیسے الفاظ سے یاد کیا ہو۔

اگر حضرت منصورؒ بدعقیدہ ہوتے تو وہ ان کے معاملے میں حضرت جنیدؒ کبھی خاموشی اختیار نہ کرتے۔ ان کی یہ خاموشی بتا رہی ہے کہ ان کی یہ ناراضی ذاتی تھی۔ ویسی ہی ناراضی جو کبھی کبھی استاد اور شاگرد کے درمیان ہو جاتی ہے۔ حضرت منصورؒ کا حال بھی یہی تھا۔ وہ بھی حضرت جنیدؒ سے ملاقات کے لیے نہیں گئے لیکن کبھی ان کی شان میں گستاخی نہیں کی۔

اہل و عیال کو بغداد میں چھوڑا اور ایک مرتبہ پھر آپ مفقود الخبر ہو گئے اور کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان میں موجود ہیں اور دعوت و تبلیغ میں مشغول ہیں۔

حضرت منصورؒ نے ہندوستان تک پہنچنے کے لیے بحری راستے کا انتخاب کیا۔ دریائے سندھ سے ہوتے ہوئے آگے بڑھتے گئے پھر ملتان پہنچے اور وہاں سے کشمیر گئے۔

کشمیر میں انہوں نے دیکھا کہ اہواز کے تجارتی قافلے کشمیر آتے ہیں اور تستر کا زربفت (قیمتی کپڑا) کشمیر لا کر فروخت کرتے ہیں۔ انہیں ایک مضبوط سہارا مل گیا۔ وہ انہی تجارتی قافلوں کے ساتھ ہو لیے اور دشوار گزار راستے طے کرتے ہوئے چین تک چلے گئے۔

یہ معلوم نہیں ہوا کہ ہندوستان میں انہوں نے کتنے عرصے قیام کیا۔ سفر کے حالات کا علم بھی نہیں ہوتا البتہ آپ کی ذات اور شخصیت کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بت پرستوں کے درمیان رہ کر اسلام کی تبلیغ ضرور کی ہوگی۔ ان کی گفتگو سن کر اور ان کی کرامات کو دیکھ کر بہت سے لوگ اسلام لائے ہوں گے۔ اس اندازے پر اس لیے بھی یقین آتا ہے کہ ہندوستان والوں نے انہیں ''مغیث'' کا لقب دیا تھا جس کے معنی ہیں فریاد کو پہنچنے والا۔ چونکہ اللہ کی ذات ہی ایسی ہے جو اپنے بندوں کی فریاد کو پہنچتی ہے۔ اس لیے یہ بھی کہا جانے لگا کہ وہ خود کو خدا کہلواتے ہیں حالانکہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ چین اور ترکستان کے لوگوں میں ''مغیث'' کے لقب سے مشہور تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ میں سے ایک اہم مقدس نام ہے جس کے معنی ہیں روزی دینے والا۔

حضرت منصور کے حاسدوں نے ان القابات سے فائدہ اٹھا کر کہنا شروع کر دیا کہ حضرت منصور خود کو ''خدا'' کہلوا کر خوش ہوتے ہیں۔ کچھ دن جاتے ہیں کہ لوگ ان کی پرستش کرنے لگیں گے۔

حضرت منصورؒ ان الزامات کی برسرِ عام تردید کر رہے تھے لیکن آوازوں کے ہجوم میں ان کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ شعبدہ باز اور جادوگر سے بات آگے بڑھ کر کافر و زندیق تک پہنچ گئی تھی۔

اب ایک ہی الزام رہ گیا تھا۔ جب آپ تیسری بار 290ھ میں حج کے لیے حجازِ مقدس پہنچے تو یہ الزام بھی شاملِ حال ہو گیا۔

سوزشِ عشق سے ایسے وارفتہ ہوئے کہ میدانِ عرفات آپ کی اس دعا سے حیرت زدہ ہو گیا۔

''اے خدائے بزرگ و برتر! مجھے اس سے زیادہ بے نوا اور حاجت مند بنا دے جیسا کہ میں نظر آتا ہوں۔ اے خالقِ عالم! مجھے رسوا کر دے تاکہ لوگ مجھ پر لعنت بھیجیں۔ اے پروردگار! لوگوں کو مجھ سے بیزار کر دے تاکہ شکر کا ہر وہ کلمہ جو میری زبان سے نکلتا ہے صرف اور صرف تیرے ہی لیے ادا کیا جائے اور اے ربِ کریم! مجھے اس بات پر استقامت عطا فرما کہ تیرے سوا کسی کا احسان نہ اٹھاؤں۔''

شیخ فریدالدینؒ نے اس دعا میں یہ اضافہ بھی کیا ہے۔

''اے رب کریم! تو سرگرداں کو راہ دکھانے والا ہے اور اگر میں واقعی کافر ہوں تو میرے کفر میں اضافہ کر دے۔''

یہ عجیب دعا تھی جو آپ مانگ رہے تھے۔ جو لوگ آپ کو بلند آواز سے دعا مانگتے دیکھ کر آپ کے پاس جمع ہو گئے تھے، انہوں نے آپ کو مجنوں سمجھا اور آپ کے پاس سے ہٹ گئے۔

عوام الناس واقف ہی نہیں تھے کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے۔ ان کے بہت سے القابات میں ایک لقب کا اور اضافہ ہو گیا۔ مشہور کر دیا گیا کہ وہ ''مجنون'' ہیں۔ مجنوں کی سزا کیا لیکن یہ سزا ہی بہت تھی کہ انہیں مجنوں کہا جا رہا تھا اور اسے مجنوں کہا جا رہا تھا جو دن رات میں چار سو رکعت نماز پڑھتے تھے اور اس قدر نماز کو اپنے اوپر فرض سمجھتے تھے۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا..... مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

دو سال بیت الحرام کی مجاوری کرتے رہے۔ واپس آئے تو حالت بالکل ہی بدل چکی تھی۔ عشق کی ''لے'' اتنی تیز ہو چکی

تھی کہ سربستہ راز برسرِ عام بیان کرنے لگے۔ خواص تو پہلے ہی حسد کی آگ میں جلنے لگے تھے۔ انہوں نے عام مخلوق کو دعوتِ فکر دی۔ یہ کلام ان لوگوں کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں جاتے مطعون ہوتے۔ جہاں قیام کرتے نکالے جاتے۔ آپ کی مخالفت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا اور آپ کو تقریباً پچاس شہروں سے نکال دیا گیا۔

☆☆☆

ابھی تک آپ کی کرامات عام لوگوں تک محدود تھیں لیکن ایک واقعہ ایسا ہو گیا کہ آپ کو دربارِ شاہی میں جانا پڑ گیا اور وہاں جو کرامت آپ سے ظاہر ہوئی اس نے آپ کو شاہی ریشہ دوانیوں میں ملوث کر دیا۔ آپ کو معلوم بھی نہ ہو سکا اور آپ کے خلاف وہ منصوبہ بندی ہوئی جس کے خطرناک نتائج مرتب ہوئے اور تاریخ اسلامی خون میں نہا گئی۔

عباسی خلیفہ مقتدر باللہ کے ایک امیر ابن نصر قشوری کو کوئی بیماری لاحق ہو گئی۔ طبیب خاص کو طلب کیا گیا۔ اس نے معائنہ کیا، دوا بھی تجویز کی لیکن فائدہ نہیں ہوا۔ پھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ بار بار دوائیں تجویز کی گئیں لیکن فائدہ نہ ہوا۔ آخر طبیب نے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا، اس مرض میں سیب کھانا مفید ہوتا ہے۔ اس کے بغیر کوئی دوا کارگر نہیں ہو گی بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں ہو گا کہ سیب کا استعمال ہی اس مرض کی دوا ہے۔ میں نے اب تک سیب اس لیے تجویز نہیں کیا تھا کہ یہ موسم سیبوں کا نہیں۔ اگر کہیں سے سیب میسر آ جائے تو آپ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔

ابن نصر قشوری کے حکم پر اس کے خدمت گاروں نے بغداد اور اس کے مضافات کا چپا چپا چھان مارا مگر سیب کہیں نہ ملا۔ جب ہر تلاش بے سود ہوئی تو ایک خدمت گار نے حضرت منصور حلاج کا حوالہ دیا۔

''یہاں ایک ولی اللہ حضرت منصور ہیں۔ اگر ان سے کہا جائے تو وہ سیب فراہم کر سکتے ہیں۔''

''وہ ولی اللہ ہیں یا سیبوں کے تاجر؟''

''وہ تاجر تو نہیں ہیں لیکن باکرامت بزرگ ہیں۔ ان کے اشارے پر سکوں کی بارش ہو جاتی ہے، یہ تو پھر سیب ہے۔''

''میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا لیکن اس وقت ہر مشورے پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔ تم انہیں بلاؤ۔ میں خود ان سے بات کروں گا۔''

''فقیروں کے مزاج آپ جانتے ہیں، اگر انہوں نے یہاں آنے سے انکار کیا تو آپ کو وہاں جانا پڑے گا۔''

''کسی کی کیا مجال جو ہمارے حکم سے انکار کر دے۔'' ابونصر نے غصے سے کہا لیکن جیسے اسے خود احساس ہو گیا ہو کہ وہ غلطی پر ہے۔ ''اچھا، اگر وہ کہے گا تو ہم اس کے پاس جانے کو تیار ہیں۔''

خدمت گار حضرت منصور کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے تمام کیفیت بیان کی۔ عجیب ماجرا ہوا کہ حضرت منصور نے خود آمادگی ظاہر کی۔

''ابونصر اچھا آدمی ہے۔ چلو اس کی عیادت کرتے ہیں۔''

حضرت منصور اس خدمت گار کے ساتھ شاہی محل میں گئے اور کسی تمہید کے بغیر امیر ابونصر سے مخاطب ہوئے۔

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہیں سیب کی حاجت ہے؟''

''جب آپ کو معلوم ہے تو سیب فراہم کیوں نہیں کر دیتے؟''

''اسی لیے تو آیا ہوں۔'' حضرت منصور نے ہاتھ بلند کیا۔ ہاتھ نیچے کیا تو اس میں سیب تھا۔ اس وقت بہت سے عمائدین موجود تھے۔ سب کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس سے قطع نظر کہ سیب کہاں سے آیا، یہ کرامت کیا کم تھی کہ کہیں جائے بغیر سیب ہاتھ میں آ گیا تھا۔

بعض لوگوں نے اسے بھی نظر کا دھوکا یا کوئی شعبدہ قرار دیا اور حضرت منصور سے پوچھا۔ ''سیب کا موسم تو نہیں، تم یہ پھل کہاں سے لائے؟''

''جنت سے۔'' حضرت منصور نے جواب دیا۔ اس جواب پر کئی چہروں پر ہنسی آ گئی۔ یہ ہنسی اس وقت ہر چہرے پر نظر آنے لگی جب اس کو کاٹا گیا تو اس میں سے ایک کیڑا نکلا۔

''لیجیے جناب! یہ عجیب جنت کا پھل ہے کہ اس میں سے کیڑا نکلا۔'' پھر کچھ لوگ حضرت منصور سے مخاطب ہوئے۔

''جنت کے پھل میں کیڑا کیسا؟''

''اس پر تعجب کی کیا بات ہے۔ یہ پھل دارِ بقا سے دارِ فنا میں آیا ہے۔ یہ تغیر اسی کی نشانی ہے۔''

اس جواب سے کچھ لوگ مطمئن ہوئے کچھ نہیں ہوئے لیکن ابونصر آپ کی بزرگی کا قائل ہوگیا۔
ابونصر کا مرض جاتا رہا تو خلیفہ مقتدر باللہ تک خبر پہنچی اور وہ بھی ان سے ملنے کا مشتاق ہوا۔
مقتدر باللہ کا وزیر حامد بن عباس آپ کا سخت ترین دشمن تھا۔ اسے جب اس تمام کارروائی کا علم ہوا تو وہ فکرمند ہوا۔
اب یہ آگ قصر شاہی تک پہنچ گئی تھی۔ اسے بجھانا ضروری تھا۔
حضرت منصور نادانستگی میں شاہی سیاست کا حصہ بن گئے۔ اب عباسی سیاست آپ کے گرد گھومنے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

☆☆☆

ایک بار تقریباً چار سو درویش سفرِ حج میں حضرت منصور کے ہمراہ تھے۔ سفر طویل سے طویل ہوتا جا رہا تھا۔ نہ پانی کی نیل تھی، نہ کھانے کی امید۔ برتی دھوپ، تپتی زمین تھی۔ تھکن تو برداشت ہو جاتی لیکن بھوک سے حال برا تھا۔ کچھ درویشوں نے ہمت کر کے حضرت منصور سے درخواست کی۔
''یہ استقامت کا سفر ہے۔ بس اسی طرح استقلال کے ساتھ چلتے رہو۔''
''اب ہم سے خالی پیٹ نہیں چلا جاتا۔''
''کچھ بھی ہو، چلنا تو ہوگا۔'' حضرت منصور نے فرمایا اور آگے قدم بڑھا دیے۔ کچھ دور جا کر آپ نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ آپ کے ساتھی تھک کر زمین پر بیٹھ گئے تھے۔ حضرت منصور واپس آئے اور درویشوں سے پوچھا۔ ''تمہیں آخر کس کا انتظار ہے۔ یہاں کیوں بیٹھ گئے؟''
''ہمیں کسی قافلے کا انتظار ہے۔ شاید کوئی قافلہ ادھر سے گزرے اور اس کے پاس غذائی سامان ہو۔''
''اگر کوئی قافلہ آیا بھی تو اس کے پاس اتنا سامان نہیں ہوگا جو تم سب کی ضرورت کو پورا کر سکے۔''
''اللہ مالک ہے۔ دیکھا جائے گا۔''
''اللہ کو مالک بھی کہتے ہو اور غیر اللہ کا انتظار بھی کر رہے ہو۔ اگر اللہ کو مالک کہتے ہو تو اس کے بھروسے پر دسترخوان بچھا لو۔ تمہارا رزق وہی تمہیں پہنچائے گا۔''
اللہ پر بھروسا تو سب کو تھا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ویرانے میں! ان کا رزق ان تک کیسے پہنچے گا لیکن تمام لوگ حضرت منصور کی کرامات سے واقف تھے اس لیے اپنے اپنے رومال زمین پر بچھا کر بیٹھ گئے کہ منصور حلاج حکم دے رہے ہیں تو اس میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوگی۔
صف بندی ہوگئی۔ تمام درویش صفیں بنا کر بیٹھ گئے۔ پریشانی ان کے چہروں سے ظاہر تھی۔ سب کی آنکھیں حضرت منصور پر جمی ہوئی تھیں۔
حضرت منصور ہاتھ پیچھے کر کے کھڑے ہوگئے۔ کچھ دیر بعد حضرت منصور کا ہاتھ سامنے آیا تو سالن کا برتن اور دو روٹیاں ان کے ہاتھ میں تھیں۔ پھر اسی طرح ہاتھ پیچھے کرتے رہے اور سالن کا برتن ایک ایک درویش کے ہاتھ میں تھماتے رہے۔
تمام لوگوں نے سیر ہو کر کھایا۔
درویشوں کو حیرت ضرور ہوئی لیکن حضرت منصور کے جواب سے سب کو تشفی ہوگئی۔
''اللہ رازق ہے۔ اس پر بھروسا کرو گے تو اسی طرح رزق ملتا رہے گا۔''
قافلے والوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوگئے لیکن انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ اب ان کی ہر خواہش پوری ہو سکتی ہے۔ کچھ دور جا کر انہوں نے اپنی دوسری خواہش کا اظہار کر دیا۔
''شیخ! ہمارا دل تازہ کھجوروں کو چاہ رہا ہے۔''
اس مرتبہ بھی حضرت منصور نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور قناعت کی تلقین کی لیکن جب وہ لوگ نہ مانے تو آپ ایک جگہ کھڑے ہوگئے۔
''مجھے زور زور سے ہلاؤ۔''
درویشوں نے ایسا ہی کیا۔ اس مرتبہ بات حیرت سے بھی آگے بڑھ گئی تھی۔ درویش منصور حلاج کے جسم کو ہلا رہے تھے اور نتیجے میں زمین پر تازہ کھجوروں کا ڈھیر لگتا جا رہا تھا۔
درویشوں نے جی بھر کے تازہ کھجوریں کھائیں اور قافلہ اپنی منزل کی جانب روانہ ہوگیا۔

JUNOVELS.COM
JUNOVELS.COM

اب حضرت منصور حلاج کی باقاعدہ نگرانی کی جارہی تھی۔ اس قافلے میں بھی وزیر حامد بن عباس کا ایک مخبر درویش کے بھیس میں موجود تھا۔ مخبر نے یہ خبر حامد بن عباس تک پہنچادی۔ حامد بن عباس پہلے ہی چوکنا ہو گیا تھا۔ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ امیر ابونصر، حضرت منصور کا عقیدت مند ہو چکا ہے۔ اس کے گھر کی بیگمات تک حضرت منصور کو ولی باکرامات تسلیم کرتی ہیں۔ ابونصر کی طرف سے اس کے دل میں جو کدورت تھی، اس کا تقاضا تھا کہ وہ اسے نیچا دکھائے۔

وہ ابھی کوئی ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ ایک اور مخبر ایک دوسری خبر لے آیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ مخبر خبر لایا تھا کہ منصور حلاج ''انا الحق'' کی صدا لگا رہے ہیں۔

یہ وقت وہ تھا جب آپ پر سکر وحدت کا غلبہ ہو گیا تھا۔ آپ درجہ فنافی الفنا پر فائز ہو گئے تھے۔ یہ غلبہ شوق اور جذبۂ عشق اور مراتب و مدارج کو ضبط نہ کرنے کی وجہ سے تھا۔ جذبۂ عشق ایک ایسی شے ہے کہ جب محبت اپنے منتہا کے مقام پر پہنچتی ہے تو عاشق اس کی سوزش سے جل جاتا ہے اور اس کو خود اپنی خبر نہیں ہوتی۔ اس کی نظر میں سوائے محبوب کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے اسے محبوب کی طرف سے سمجھتا ہے۔ رات اور دن کی ظاہری اور باطنی نگاہ میں سب اس کو محبوب دکھائی دیتے ہیں حتیٰ کہ اسے دونوں عالم میں سوائے محبوب کے جلوے کے اور کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ جب عاشق اس درجے پر پہنچتا ہے تو اس کے سامنے جو چیز بھی آتی ہے وہ محبوب کے جلوے کی کثرت سمجھتا ہے۔ پس حضرت حسین بن منصور حلاجؒ اس مقام و حال میں تھے۔ عالم بے خودی اور فرطِ عشق کے غلبے سے انا الحق کہہ بیٹھے۔ دراصل ان کی نگاہ میں سوائے محبوب کے اور کوئی نہیں سما سکتا تھا۔

ظاہر بیں نگاہیں آپ کی اس کیفیت کو نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ فقہاء بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ وہ خود پر قابو نہ پا سکے اور ایک اہم راز ظاہر کر بیٹھے۔ اس کی انہیں سزا ملی۔

وزیر حامد بن عباس کو ان حالات کی خبر ہو گئی تو اسے ایک بہترین موقع ہاتھ آ گیا۔ وہ ابھی مقتدر باللہ سے ملاقات کا فیصلہ کر ہی رہا تھا کہ 301ھ میں حضرت منصور اور آپ کے غلام کو گرفتار کر کے بغداد پہنچادیا گیا اور دو اونٹوں پر سوار کر کے گلی گلی تشہیر کرائی اور ان پر ایک کتبہ بھی لگوادیا جس پر تحریر تھا۔ ''میرے پاس شہادت موجود ہے کہ حلاج خدائی کا دعویٰ کرتا ہے اور حلول کا قائل ہے''۔

حضرت منصور کی گرفتاری کو درست ثابت کرنے کے لیے ان پر مختلف الزامات لگائے گئے تھے یا یوں کہہ لیجیے کہ مختلف اسباب تھے جو آپ کی گرفتاری کا بہانہ بنے۔

پہلا سبب یہ قرار دیا گیا کہ منصور حلاجؒ قرآن کے مثل آیت بنانے کا دعویٰ کرتا ہے۔

دوسرا الزام یہ لگایا گیا کہ منصور نے ایک خط کے ذریعے اپنے خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کی بنیاد ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک خط قرار دیا گیا تھا۔

تیسرے الزام کے مطابق وہ جادو کا علم سیکھنے ہندوستان گئے تھے۔ (ان کی کرامات کو جادو کا نام دیا جارہا تھا)۔

حضرت منصور کی گرفتاری کا چوتھا سبب ان کا زندیقوں جیسا کلام تھا۔

پانچواں سبب وہ کفریہ اشعار تھے جو آپ کی زبان سے ادا ہوئے یا ان کے نام سے پھیلا دیے گئے۔

ایک اور سبب یہ بھی بتایا گیا کہ ان کے مرید اور خدمت گار انہیں خدا مانتے ہیں اور وہ انہیں نہیں روکتے۔

اب ساتواں الزام یہ بھی آ گیا تھا کہ وہ انا الحق کا نعرہ لگاتے ہیں۔

ان الزامات کی سچائی کا عالم یہ تھا کہ آپ نو سال تک جیل کی تاریکی میں رہے اور ان میں سے کوئی الزام بھی ثابت نہ ہو سکا۔

روایت ہے کہ منصور حلاج اس وقت شاہی محل میں نظر بند تھے اور خاص و عام کو ان سے ملنے کی اجازت تھی۔ ابن نصر قشوری ان کا نگہبان تھا جو ان کا عقیدت مند تھا لہٰذا آپ کو تمام سہولتیں حاصل تھیں۔ خاص و عام کو ان سے ملنے کی اجازت تھی۔ حاسدین کو یہ رعایت قابلِ قبول نہیں تھی لہٰذا خلیفہ مقتدر نے حلاج کو علی بن عیسیٰ کے حوالے کر دیا۔ یہی وہ نقطۂ آغاز تھا جب آپ کو سختیوں کا نشانہ بننا تھا۔ علی بن عیسیٰ انہیں روزانہ اپنی مجلس میں طلب کرتا اور طرح طرح سے ذلیل کرتا۔ جب بات آپ کی برداشت سے آگے بڑھ گئی تو ایک دن علی بن عیسیٰ کو آپ کے جلال کا سامنا کرنا پڑا۔

UUNOVELS.COM

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ کڑوی بات: دنیا کے سارے کافر مل کر بھی جتنی مرضی سازشیں کر لیں، یہ کبھی بھی مسلمانوں کو عقل استعمال کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ بات تو سچ ہے مگر کڑوی ہے۔ (مستنصر حسین تارڑ)

☆ محبت: محبت تو یہ ہے کہ کوئی آپ کو احساس دلائے بغیر آپ کے درد کو سمیٹ لے۔ آپ کی کمزوریوں کو ڈھانپ لے۔ اس میں نہ کوئی وعدے ہوں، نہ کوئی انتظار۔ اس میں کچھ طلب کرنے کی نوبت ہی نہ آئے ورنہ راستے میں رہنا، گفتگو میں بلند و بانگ دعوے کرنا، زبان کا چسکا تو ہو سکتا ہے محبت نہیں۔ (اشفاق احمد)

منزل: اگر آپ راستے میں بھونکنے والے ہر کتے کو رک کر پتھر مارتے رہیں گے تو یقین کیجیے، آپ اپنی منزلِ مقصود پر کبھی بھی نہیں پہنچ سکتے۔ (سر ونسٹن چرچل)

☆ سیکھا: میں نے تمیز، بدتمیز لوگوں سے، خاموشی باتونی لوگوں سے اور ادب بے ادب لوگوں سے سیکھا ہے۔ (خلیل جبران)

☆ معافی: دنیا میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو دکھ، تکلیف، دھوکا تو انسانوں کو دیتے ہیں اور معافی اللہ سے مانگتے ہیں۔ (شیخ سعدی)

☆ فکر: ہمارے اپنے گریبان میں سانپ اور بچھو لٹک رہے ہوتے ہیں اور ہم دوسروں کی کھیاں اڑانے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ (اشفاق احمد)

☆ مذہب: لوگ مذہب کی خاطر لڑیں گے، جھگڑیں گے، مذہب پر لکھیں گے، لیکچر دیں گے، حتیٰ کہ مذہب کی خاطر جان دے دیں گے مگر مذہب کے مطابق زندگی بسر نہیں کریں گے۔ (خلیل جبران)

☆ وجہ: کہتے ہیں کہ رزق عورت کے مقدر سے ملتا ہے اور اولاد مرد کے مقدر سے ملتی ہے لیکن اکثر یوں ہوتا ہے کہ اولاد نہ ہونے پر ہر مرد عورت کو چھوڑ دیتا ہے اور رزق نہ ہونے پر یا کمی ہونے کی وجہ سے عورت مرد کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔

☆ صورت بغیر سیرت کے ایسا پھول ہے جس میں کانٹے تو بہت زیادہ ہوں مگر خوشبو بالکل نہ ہو۔

مرسلہ: جاوید اختر رانا۔ حیدر آباد

''اے علی بن عیسیٰ! اگر اب تیری گندی زبان سے ایک لفظ بھی اور نکلا تو میں تیرے اوپر زمین کا تختہ الٹ دوں گا۔''

وہ آپ کا یہ غصہ دیکھ کر ڈر گیا۔ آپ کی کرامات سے واقف تھا۔ اقتدار کے نشے میں مست ہو کر لعن طعن کر رہا تھا لیکن جیسے ہی آپ کی پیشانی پر بل دیکھے تو سہم گیا۔ اسی وقت آپ کو اپنی مجلس سے رخصت کر دیا اور سوچ لیا کہ وہ اس معاملے سے خود کو الگ کر لے گا۔

ادھر وزیر حامد بن عباس برابر ان کوششوں میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح منصور حلاج کو اس کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ ان پر کفر کا الزام ثابت کر کے پھانسی کے پھندے پر لٹکا دے۔ یہ دراصل ابن نصر قشوری کو نیچا دکھانے کا منصوبہ تھا۔

اس نے ایک روز رات کی تنہائی میں خلیفہ مقتدر باللہ سے ملاقات کی اور اپنی چرب زبانی سے اسے قائل کر لیا کہ حضرت منصور کو وہ اس کے حوالے کر دے۔

''آخر تم یہ کیوں چاہتے ہو کہ اس صوفی کو تمہارے حوالے کر دیا جائے؟'' خلیفہ نے پوچھا۔

''اس لیے کہ اس کی موجودگی سے خلقِ خدا میں بگاڑ پیدا ہو رہا ہے۔''

''اس کی گرفتاری سے کیا ہو گا؟''

''میں یہ نہیں چاہتا کہ اسے ہمیشہ کے لیے گرفتار کر لیا جائے بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ اس پر جو الزامات ہیں، ان کی پوری طرح تحقیق ہو اور ان لوگوں کو سزا ملے جو اس کے نام سے یہ باتیں پھیلا رہے ہیں۔'' حامد بن عباس نے مکر سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''تمہاری نیت اچھی ہے لیکن میں پھر بھی یہ چاہوں گا کہ منصور کے معاملے میں انصاف سے کام لیا جائے۔ یہ نہ ہو کہ ہم کسی پاکباز کو سزا دے بیٹھیں۔''

''میری ان سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں۔'' حامد بن عباس نے کہا۔

خلیفہ کو احکامات جاری کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ اس سے پہلے ہی علی بن عیسیٰ کی درخواست پہنچ گئی۔ وہ اس معاملے سے خود کو الگ کر رہا تھا۔

حضرت منصور کو حامد بن عباس کے حوالے کر دیا گیا۔ اس سفاک نے آپ کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر حوالۂ زنداں کر دیا اور نگہبانی کے لیے پہرے داروں کی بڑی تعداد مقرر کر دی۔ اس نے کئی ماہ تک آپ کو جیل کی تاریک کوٹھڑی میں قیدِ تنہائی میں رکھا تاکہ بقول اس کے آپ کا دماغ درست ہو جائے۔ اس عرصے میں وہ اپنے حق میں علماء کی رائے بھی ہموار کرتا رہا تاکہ حضرت منصور کے خلاف فتویٰ لے سکے۔ جب اس نے چند علماء کو اپنا ہم نوا بنا لیا تو حضرت منصور کو اپنی مجلس میں طلب کیا۔ بغداد کے کئی نامور علماء اس مجلس میں موجود تھے۔ حامد بن عباس نے آپ سے گفتگو شروع کی۔ بہت سے ایسے بے ہودہ سوال کیے جس پر غصہ آنا لازمی تھا لیکن آپ کمال برداشت سے سنتے رہے۔ ایسے نپے تلے جوابات دیے کہ اعتراض کا کوئی موقع نہ ملنے پائے۔ حامد بن عباس نے بہت کوشش کی کہ آپ کوئی کمزور جواب دیں اور علماء اسے واجب القتل قرار دیں لیکن آپ نے یہ موقع نہ دیا۔

مجلس برخاست ہو گئی۔

دوسرے دن پھر ایسی ہی مجلس منعقد ہوئی۔ ان الزامات کو ایک ایک کر کے بیان کیا گیا جو آپ پر لگائے گئے تھے۔ آپ نے ان الزامات کی صحت سے انکار کیا۔

''میں نہ تو شعبدہ باز ہوں نہ ساحر۔ نہ کفریہ کلام کہتا ہوں۔ اللہ کا بندہ ہوں۔ اسی کی عبادت کرتا ہوں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری رسول مانتا ہوں۔ اس کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ اگر آپ لوگوں کے پاس کوئی شہادت ہے تو پیش کریں۔''

یہاں شہادت کس کے پاس تھی۔ سنی سنائی باتوں پر مقدمہ لڑا جا رہا تھا۔ بات یہیں سے شروع ہوتی تھی کہ ہم نے فلاں سے سنا، فلاں نے فلاں سے سنا۔ رہی بات کرامات کی تو علمائے حق یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ ایسی کرامات اہلِ اللہ سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔

جب کئی ماہ اس تحقیق میں گزر گئے اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا تو حامد بن عباس غصے سے بے قابو ہو گیا۔ اس نے اپنے ہم نوا علماء سے بھی باز پرس کی اور اپنے مخبروں کے بھی کان کھینچے۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم لوگ غلط اطلاعات پہنچاتے رہے ہو۔ اس پر کوئی الزام ثابت ہی نہیں ہونے پاتا۔''

''ہماری اطلاعات غلط نہیں۔'' مخبروں نے کہا۔ ''اس پر جو الزامات ہیں، وہ تحریری شکل میں نہیں اس لیے وہ بڑی ہوشیاری سے انکار کر دیتا ہے۔''

''کچھ بھی ہو جائے۔ مجھے ایسے ثبوت درکار ہیں جنہیں بنیاد بنا کر میں اسے پھانسی کے پھندے پر لٹکا سکوں۔''

''اب تو ایک ہی صورت ہے۔'' ایک مخبر نے اٹھ کر کہا۔ ''میری رسائی ایسے لوگوں تک ہے جو منصور کو خدا تسلیم کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو بلایا جائے۔ اگر انہوں نے قبول کر لیا تو منصور پر الزام خود بخود ثابت ہو جائے گا۔''

حامد بن عباس کو نئی راہ مل گئی۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ مخبر ایسے لوگوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ایسے لوگ جہاں سے ملے، انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

یہ لوگ کمزور بھی تھے، نادان بھی اور کم پڑھے لکھے بھی۔ حامد بن عباس کے تیز و تند سوالات کا زیادہ دیر مقابلہ نہ کر سکے اور جلد ہی اقرار کر بیٹھے۔ انہوں نے تسلیم کر لیا کہ وہ حلاج کو خدا تسلیم کرتے ہیں۔ حامد بن عباس نے ایک کاغذ پر لکھوا لیا اور ان کے دستخط لے لیے تاکہ وہ انکار نہ کر سکیں۔

دوسرے دن اس نے حضرت منصور کو بھی طلب کیا اور ان لوگوں کو بھی بلوایا۔

''کیا تم ان لوگوں کو پہچانتے ہو؟''

''ہاں، ان میں سے اکثر کو پہچانتا ہوں۔ یہ لوگ اکثر میرے پاس آیا جایا کرتے تھے۔''

''جانتے ہو یہ تمہارے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''تو دلوں کا حال جانتا ہے۔ یہ نہیں جانتا کہ ان کے دلوں میں کیا ہے؟''

''میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ میں دلوں کا حال جانتا ہوں۔ ہاں اتنا جانتا ہوں جتنا میرا خدا مجھے بتا دیتا ہے۔''

''یہ لوگ تجھے خدا مانتے ہیں۔ انہوں نے لکھ کر دے دیا ہے۔''

''میں کسی کے قول و فعل کا ذمے دار نہیں۔ یہ میرے بارے میں کچھ بھی گمان کریں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔''

حامد بن عباس کا یہ وار بھی خالی گیا۔ علماء نے فتویٰ دینے سے انکار کر دیا۔

''ان لوگوں کے اقرار سے قصوروار یہ لوگ خود ہوتے ہیں حضرت منصور نہیں۔''

حامد بن عباس تلملا کر رہ گیا۔ اسے ان لوگوں سے سروکار نہیں تھا۔ اسے تو حضرت منصور کو تہ تیغ کرنا تھا۔ اس نے لوگوں کو جانے دیا۔ ان لوگوں نے باہر نکل کر اسے بھی حضرت منصور کی کرامت سے تعبیر کیا ورنہ ایسے جابر وزیر سے چھٹکارا ملنا آسان نہیں تھا۔

یہ مقدمہ ایسا نہیں تھا کہ بغداد تک محدود ہو کر رہ جاتا۔ اس کی گونج دور دور تک سنائی دے رہی تھی۔ قصر شاہی میں تو چند علماء ہی آتے تھے۔ باہر بیٹھے ہوئے علماء میں بھی یہ بحث جاری تھی۔ اسی لیے حامد بن عباس ڈرتا تھا کہ اگر کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر حضرت منصور کو سولی پر چڑھا دیا گیا تو سارا الزام اس پر آ جائے گا۔ اسی لیے وہ نامور علماء و مشائخین سے فتویٰ لینے پر بضد تھا لیکن وہ ریاستی جبر کے باوجود زیر دام آنے کو تیار نہیں تھے بلکہ بعض تو وہ تھے جو کبھی حضرت منصور کے خلاف تھے لیکن تحقیق کے بعد اپنی رائے تبدیل کر لی تھی۔

ایسے لوگوں میں حضرت ابوالعباس ابن عطا جیسے بزرگ کا نام بھی آتا ہے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ منصور حلاج کے قبضے میں جنات ہیں لیکن جب ایک سال بعد ان سے ان کی رائے پوچھی گئی تو انہوں نے جواب دیا۔ ''حسین بن منصورؒ کی کرامات حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔''

جب ان سے پوچھا گیا کہ رائے بدلنے کی وجہ کیا ہے؟ تو آپ نے جواب دیا۔ ''اس وقت مجھے منصور حلاج کے حالات کی تفصیل تحقیق کے ساتھ معلوم نہیں تھی مگر اب میں اس حقیقت سے واقف ہو چکا ہوں۔''

حامد بن عباس تک یہ خبریں تواتر سے پہنچ رہی تھیں۔ اس کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد اس معاملے کو کسی نتیجے تک پہنچا دینا چاہتا تھا۔

اس وقت یہ طریقہ عام تھا کہ کتابوں میں تحریفات کر دی جاتی تھیں۔ حضرت منصور کی بھی کسی تصنیف میں تحریف کی گئی اور اس کے مضامین کو بنیاد بنا کر قتل کا فتویٰ لکھوا لیا گیا۔ کسی نے یہ زحمت بھی نہ کی کہ جو کتاب برسرِ مجلس دکھائی گئی، اس کی تحقیق کی جاتی کہ اصل کے مطابق ہے یا نہیں۔ بس حضرت منصور سے یہ پوچھا گیا کہ یہ تصنیف تمہاری ہے اور بس۔ اور یہ پوچھا گیا کہ تو نے اس کتاب کے لیے مضامین کہاں سے اخذ کیے۔ آپ نے حضرت حسن بصری کی کتاب کا نام لے دیا۔

مؤرخ خطیب بغدادی نے تحریر کیا ہے کہ حامد بن عباس کی مجلس میں حضرت منصور ملزم کی حیثیت سے کھڑے تھے جبکہ اس مجلس میں قاضی ابوعمر، قاضی ابوجعفر، قاضی ابوالحسن اور دیگر علمائے کرام کی ایک جماعت موجود تھی۔

جرح کے دوران قاضی ابوعمر کے منہ سے منصور حلاجؒ کے خلاف یہ بات نکل گئی۔ ''اے حلال الدم۔'' (حلال الدم اسے کہتے ہیں جس کا خون جائز ہو)۔

یہ لفظ سنتے ہی وزیر حامد بن عباس چونکا جیسے گوہر مقصود ہاتھ آ گیا ہو اور قاضی ابوعمر کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''حضرت! یہ جو ابھی آپ نے کہا ہے اسے کاغذ پر لکھ دیجیے۔''

مطلب یہی تھا کہ قتل کا فتویٰ فرما دیں۔

قاضی ابوعمر کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ غصے میں نامناسب لفظ کہہ بیٹھے ہیں۔ انہوں نے بات ٹالنے کی کوشش کی لیکن حامد بن عباس اپنی بات پر اڑا رہا۔

''آپ نے ابھی کہا ہے کہ منصور حلاج واجب القتل ہیں۔ اسے ایک کاغذ پر لکھ دیں۔''

قاضی ابوعمر نے پھر بات ٹالنے کی کوشش کی۔ حامد بن عباس بھی ہوشیار آدمی تھا۔ سمجھ گیا کہ قاضی صاحب اپنے ہی کلمات میں الجھ گئے ہیں اور اب نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حامد بن عباس نے قلم دوات اور کاغذ قاضی

ابو عمر کے سامنے رکھ دیا اور نہایت سخت لہجے میں کہا۔ ''تم نے ابھی جو کچھ منصور حلاج کے بارے میں کہا ہے اسے اس کاغذ پر لکھو۔''

یہ درخواست نہیں حکم تھا۔

قاضی ابو عمر نے حامد بن عباس کے تیور دیکھے تو اقتدار کی بھول بھلیاں یاد آنے لگیں۔ انہوں نے قلم اٹھایا اور لکھ دیا کہ منصور حلاج کا قتل جائز ہے۔

حامد بن عباس کا مقصد پورا ہوا۔ اس نے اس کاغذ کو مجلس میں موجود دیگر علمائے کرام کے سامنے باری باری پیش کیا۔ اب کس کی ہمت تھی کہ دستخط نہ کرتا۔

ایک ایک کر کے اس ناحق قتل پر مہریں لگنے لگیں۔

پورا مقدمہ پہلے دن ہی سے یک طرفہ تھا۔ اس وقت بھی یہ ساری کارروائی یک طرفہ ہو رہی تھی۔ حضرت منصور حلاج یہ تمام منظر خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ پھر آپ کی آواز گونجی۔

''میری پشت شرعی طور پر ممنوع و محفوظ ہے اور میرا خون حرام ہے۔ تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم جھوٹی باتوں کی بنا پر میرے قتل کا فتویٰ دو حالانکہ میرا عقیدہ اسلام کے موافق ہے۔ میرا مذہب سنت مطہرہ کے مطابق ہے اور میں چاروں خلفائے راشدین اور تمام عشرہ مبشرہ کی فضیلت کا قائل ہوں۔ سنت کے بیان میں میری تصانیف کتب فروشوں کے پاس ہیں۔ پس میرے قتل کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔''

حضرت منصورؒ اللہ سے ڈرو کی تکرار کر رہے تھے اور علماء برابر ان کے قتل نامے پر دستخط کرتے جا رہے تھے۔ کسی نے آپ کی بات پر دھیان نہیں دیا۔

حامد بن عباس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اس نے مجلس برخاست کر دی۔

حضرت منصور کو پھر اسی قید خانے میں بھیج دیا گیا جہاں وہ قید تھے۔

یہ مقدمہ نو سال تک چلتا رہا تھا۔ کوشش کے باوجود کوئی ٹھوس ثبوت نہ مل سکا تھا اور پھر اچانک ایک لفظ ''حلال الدم'' کو بنیاد بنا کر اتنا بڑا فیصلہ کر لیا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پسِ پردہ حقائق کچھ اور تھے۔

حضرت منصور کی زندگی کی طرح ان کا مقدمہ بھی پراسرار ہی رہا۔

☆☆☆

اس رات آپ اپنے اس کمرے سے باہر نکل آئے جہاں آپ کو قید کیا ہوا تھا۔ اسی رات ایک واقعہ پیش آیا۔ آپ اپنے کمرے میں بند تھے۔ جیل کے دوسرے کمروں میں تقریباً تین سو قیدی بند تھے۔ آپ کے پیروں میں بھاری بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ باہر تالا بھی موجود تھا لیکن آپ کسی روحانی قوت کی بدولت کمرے سے باہر آ گئے اور دوسرے قیدیوں کے پاس آئے اور ان سے فرمایا۔ ''کیا میں تم سب کو رہا کر دوں؟''

قیدیوں نے آپ کے پیروں کی طرف دیکھا جن میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ انہیں حیرت ہوئی کہ اس شخص کے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں اور یہ ہمیں آزاد کرنے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ آخر ان سے رہا نہیں گیا اور آپ سے پوچھا۔

''آپ اگر اتنی طاقت رکھتے ہیں تو خود کو آزاد کیوں نہیں کرا لیتے؟''

''تم اپنی مرضی بتاؤ۔ میری فکر چھوڑو۔ میں تو اللہ تعالیٰ کی قید میں ہوں۔ شریعت کا پاس کرتا ہوں اس لیے خود کو رہا نہیں کرا سکتا۔'' آپ نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی آپ کے ایک اشارے سے تمام قیدیوں کی بیڑیاں ٹوٹ گئیں۔

اب تک یہ قیدی اس دعوے کو مذاق سمجھ رہے تھے لیکن اب وہ حیرتوں کے پہاڑ تلے دب گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔

(جاری ہے)

UUNOVELS.COM

دنیا گول

ناہید سلطانہ اختر

دائرے کی خوبی یہ ہے کہ جس نقطہ سے آغاز ہوتا ہے اسی پر اختتام بھی ہو جاتا ہے... گویا سفر کیا ہی نہ ہو مگر... تھکن بتاتی ہے کہ جیسے کوئی اپنی مکمل زندگی جی چکا اور... آخر میں اس کے حصے میں بھی محض تھکن تو آئی تھی... بچپن کی محبت جب خیالوں میں ساتھ رہے تو حقیقت میں کبھی ساتھ نہیں مل پاتا... بس یہی حقیقت اس نے بھی تسلیم کر لی تھی۔

زمانہ طالب علمی کی بے شمار یادوں میں سے

ایک خوب صورت یاد کا سہارا

دنیا گول ہے!
دنیا واقعی گول ہے!

عدنان جس کا نک نیم سنی تھا، انگلستان کے مقام سلاؤ میں پیدا ہوا تھا۔ یوں پیدائشی طور پر وہ برطانوی قومیت کا حامل تھا لیکن ناگزیر خاندانی حالات کے باعث اسے چار سال کی عمر میں اپنے والدین کے وطن پاکستان آنا پڑا جہاں وہ اپنے افرادِ کنبہ کے ساتھ تقریباً نو برس مقیم رہا پھر چند اسباب کے تحت اسے اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے

ساتھ انگلستان مراجعت کرنا پڑی۔

پاکستان میں نو سالہ قیام کے دوران سنی کے باپ نے اسے اور اس کے باقی بہن بھائیوں کو شہر کے ایک انگریزی تعلیمی ادارے میں داخل کرا دیا تھا۔ پہلے سنی کی بڑی بہن فائزہ اور بھائی رحمان اس اسکول میں داخل کیے گئے۔ پھر سنی اور دو ڈھائی برس کے وقفے سے اس کی چھوٹی بہن عائزہ کا داخلہ کرا دیا گیا۔

مذکورہ تعلیمی ادارہ شہر کا ایک مستند تعلیمی ادارہ تھا جہاں امیر اور خوش حال گھرانوں کے بچے ہی تعلیم حاصل کر پاتے تھے۔ فیس بہت زیادہ تھی اور معاشی اعتبار سے کمزور گھرانے اپنے بچوں کو اس ادارے میں تعلیم دلوانے کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔

ادارہ وسیع و عریض رقبۂ اراضی پر قائم تھا۔ ادارہ ایک نہیں کئی عمارتوں میں بٹا ہوا تھا اور تمام عمارات نہایت شاندار تھیں۔ کشادہ، روشن، ہوا دار اور آرام دہ کمرے، طویل راہداریاں، آرام دہ فرنیچر، تقریبات کے لیے وسیع و عریض سماعت گاہ..... کھیلوں کے میدان، کیفے ٹیریا، بک شاپ، یونیفارم شاپ اور بار برشاپ۔

انتظامی طور پر ادارہ ایک ہی سربراہ کی زیر نگرانی تھا۔ سربراہِ ادارہ انگلستان کی ایک معروف یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھے۔ ان کی نگرانی میں ادارہ تین مختلف سیکشنز میں کام کر رہا تھا۔ جونیئر ونگ جس کی منتظمہ ایک خاتون تھیں۔ اس سیکشن میں لڑکے اور لڑکیاں پانچویں جماعت تک اکٹھے تعلیم حاصل کرتے۔ پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد لڑکیاں گرلز ونگ میں چلی جاتیں اور لڑکے بوائز ونگ میں۔ چھٹی جماعت سے دسویں جماعت تک طلباء اور طالبات کے لیے علیحدہ علیحدہ عمارات تھیں۔ وقفہ تینوں ونگز کو مختلف اوقات میں دیا جاتا۔ وقفے کے دوران طلبہ میدان میں چلے جاتے جہاں ایک جانب کیفے ٹیریا اور کینٹین کے ساتھ یونیفارم اور بک شاپس تھیں اور بار برشاپ بھی۔ تمام دن اسکول پروکٹر، اسپورٹس ٹیچرز اور پی ٹی ماسٹر اپنی چھڑیوں اور گلے میں پٹے سے لٹکی سیٹیوں کے ساتھ مستعد پھرتے اور حسبِ ضرورت اپنی اپنی سیٹیاں بجاتے رہتے۔

شہر کے متمول گھرانے اس ادارے میں اپنے بچوں کو تعلیم دلوانا باعثِ فخر سمجھتے تھے۔

سنی اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے ہمراہ پاکستان آمد کے بعد تقریباً ایک سال کے وقفے سے اس ادارے میں پہلی جماعت میں داخل ہوا اور ساتویں جماعت تک وہاں پڑھتا رہا۔ طبعاً وہ کم گو، شرمیلا اور اپنی ہی دنیا میں گم رہنے والا بچہ تھا۔ وہ ذہین اور تمیز دار تھا۔ اس کی دوستی جماعت کے چند ہی بچوں سے تھی اور وہ سب کے سب بھی ذہین اور پڑھاکو تھے۔ پانچویں جماعت تک لڑکیاں بھی سنی اور دیگر ہم جماعت لڑکوں کے ساتھ پڑھتی رہیں۔ چھٹی جماعت میں بٹوارا ہو گیا۔ لڑکیاں گرلز ونگ میں چلی گئیں اور لڑکے بوائز ونگ میں آ گئے۔

ساتویں جماعت کے سالانہ امتحانات کے بعد سنی کو اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے ساتھ انگلستان مراجعت کرنا پڑ گئی۔ اس کے والد نے پاکستان میں اپنا کاروبار جمانے کی پوری کوشش کی مگر اتنی مشکلات نے گھیرا ڈالا کہ بالآخر انہوں نے انگلستان واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہاں بھی محنت تو کرنا پڑتی تھی مگر یہاں کی طرح حالات دگرگوں نہ تھے۔

انگلستان واپسی کے بعد سنی کو نئے اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ شروع شروع اسے اپنے پاکستانی ہم جماعت بہت یاد آئے لیکن آہستہ آہستہ وہ نئے دوستوں کا عادی ہو گیا۔ پاکستان کی طرح انگلستان میں بھی اس کی دوستی چند ہی ہم جماعتوں سے ہو سکی۔

انگلستان واپسی کے بعد اس کے باپ نے اپنا کاروبار شروع کیا اور مسلسل محنت اور دیانتداری سے اس کے کاروبار نے خوب فروغ پایا۔

☆☆☆

کئی سال بیت گئے۔

سنی کی بڑی بہن اور بھائی اپنی اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد زندگی کے نئے راستوں، نئی منزلوں کے راہی ہو گئے۔ اس کی بڑی بہن نے ایک مصری نوجوان کو اپنا ہمسفر بنا لیا۔ بھائی جو رئیل اسٹیٹ بزنس میں تھا، ایک اسکاٹش دوشیزہ کے دامِ الفت کا اسیر ہو کر اس سے شادی رچا بیٹھا۔ باپ اس کے اس اقدام سے خوش نہ تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کوئی مسلمان لڑکی بہو بن کر اس کے گھر آئی ہوتی۔ اپنی اس خواہش میں وہ تنہا نہ تھا۔ اس کی بیوی بھی یہی چاہتی تھی۔ ان جیسے لاتعداد والدین تھے دیارِ غیر میں جن کے بیٹے اور بیٹیاں غیر مذہب یا لامذہب مرد و زن سے زندگی کا رشتہ جوڑے بیٹھے تھے۔ ترکِ وطن سے حاصل ہونے والے سود کو کچھ تو زیاں بھی بھگتنا ہی تھا۔

سنی کی شادی کا مرحلہ آیا تو سنی نے والدین کے کہے بنا خود ہی اس خواہش کا اظہار کر دیا کہ وہ پاکستان جا کر

UUNOVELS.COM

پاکستانی مسلمان لڑکی سے شادی کرے گا۔ ماں اور باپ کی تو امیدوں کے کنول کھل اٹھے۔ ماں تو کب سے اپنے بہن بھائیوں میں سے کسی کی بیٹی کو بہو بنا کر لانے کی خواہش دل میں پال رہی تھی۔ سنی اگر اپنے ددھیال میں کسی لڑکی کا انتخاب کر لیتا تو ماں کو اس پر بھی چنداں اعتراض نہ تھا۔ اپنا اگر ننھیالی ہو تو کیا کہنا۔ ددھیالی بھی غیر سے بہتر اور غیر مذہب سے تو نا قابل شمار گنا اعلیٰ و برتر!

سنی کو اس کے ماں باپ شادی کے ارادے سے پاکستان لے آئے۔ خیال یہ تھا کہ سنی خاندان کی لڑکیوں کو خود دیکھے اور لڑکی کا انتخاب خود کرے۔ یہ تو طے تھا کہ ننھیال یا ددھیال میں سے وہ جس لڑکی کا انتخاب کرے گا، لڑکی والوں کی طرف سے اسے پذیرائی ملے گی۔ ننھیال اور ددھیال دونوں اطراف کے رشتے دار ان کی قدم بوسی کو فعال ہو گئے۔ والدین اور لڑکیاں سنی اور اس کے اماں ابا کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانے لگیں۔ والدین ایک دوسرے کو حریفانہ تیوروں سے دیکھتے۔ لڑکیاں ایک دوسرے سے رشک و حسد میں مری جاتیں۔ ہر دل اس جستجو میں تھا کہ قرعۂ فال کس کے نام کھلتا ہے۔

سنی اور اس کے والدین کی روزانہ ہی کسی نہ کسی رشتے دار کے ہاں دعوت ہوتی اور ہر دعوت میں وہ اہتمام ہوتا جیسے سنی کی شادی کی بات چیت اسی گھرانے میں طے ہونے جا رہی تھی۔ سنی اور اس کے والدین ہی نہیں، اس کی بہنوں اور بھائی حتیٰ کہ مصری نژاد بہنوئی اور اسکاٹش بھابی کے لیے بھی تحائف دیے جاتے۔ امیدوار لڑکیاں خوب بن سنور کر سنی اور اس کے اماں ابا کے سامنے آتیں اور اپنی اداؤں سے سنی کو اور باتوں سے اس کے والدین کو لبھانے کی کوشش کرتیں۔

بھلا ہو سنی کا یا شاید بُرا کہ خاندان کے تمام گھرانوں کی دعوتیں اڑانے، تحائف سمیٹنے اور لڑکیاں دیکھنے کے بعد جب سنی سے اس کی پسند پوچھی گئی تو اس نے ایک ہوشربا انکشاف کیا اور وہ یہ کہ پاکستان تو وہ اپنے پرائمری اسکول کی ایک کلاس فیلو سے شادی کی خواہش دل میں لے کر آیا تھا۔ اپنی اس خواہش کا اظہار اس نے اپنے ایک کزن سے کیا جس سے اس کی خاصی ذہنی ہم آہنگی ہو گئی تھی۔ اسی کزن کے توسط سے والدین کو فراہم کی جانے والی تفصیلات کے مطابق..... سنی کی مذکورہ ہم جماعت ان دنوں جب وہ اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے ساتھ پاکستان میں قیام پذیر تھا، پہلی جماعت سے پانچویں جماعت تک اسکول کے

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی

ماہنامہ
سرگزشت

شمارہ مارچ 2020ء
کی جھلکیاں

بے اماں

اپنے وطن میں بھی اسے اماں نہ ملی، وہ آزاد بھی تھا اور اسیر بھی

خاک

درندہ صفت دہشت گردوں کے سامنے وہ سینہ سپر تھا

بریکنگ نیوز

مسرد ہو کر بھی اس نے تین بچوں کو جنم دیا، انتہائی حیران کن واقعہ

فراری

وڈیروں کی جیل سے فرار ہونے والے جوڑے کی دلچسپ سچ بیانی

اس کے علاوہ

طویل سرگزشت ''روسیاہ''، فلمی دنیا کی دلچسپ داستان ''باپ بیٹا'' ایک الگ انداز کا سفرنامہ ''سفر پہلا پہلا''

اور بھی بہت سے سچے واقعات، دلچسپ سچ بیانیاں، سچے قصے، اہل ذوق کے لیے ہر تحریر قیمتی تحفہ ہے

جونیئر ونگ میں اس کے ساتھ پڑھتی رہی تھی اور سنی کو وہ دل ہی دل میں بہت اچھی لگتی تھی۔ سنی کو ان دنوں محبت کے معنی تو کیا شاید محبت کی "ب" پر تشدید کا علم بھی نہیں تھا مگر بہت سال بعد اس پر یہ کھلا تھا کہ وہ آفرین سے محبت کرتا تھا۔ آفرین اسی لڑکی کا نام تھا۔ باپ کے نام کی نسبت ساتھ لگ کر اس کا نام آفرین حیات بن جاتا تھا۔ حاضری لیتے ہوئے جب کلاس ٹیچر آفرین حیات کا نام پکارتی تو سنی کے کان کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔

سنی نے اپنے بچپن کی اس محبت کا اپنے کزن پر انکشاف کرتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ بس دور دور سے اسے دیکھ کر شرمایا کرتا تھا۔ دونوں میں کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ بھولے سے بھی نہیں مگر وہ اسے اچھی لگتی تھی۔ اتنی اچھی کہ وہ پانچویں جماعت پاس کر کے اسکول کے جونیئر ونگ سے بوائز ونگ میں جانے کے بعد بھی اسے نہیں بھول پایا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ تقریباً دو سال بوائز ونگ میں گزارنے کے بعد اپنی فیملی کے ساتھ انگلستان واپس چلے جانے کے بعد بھی وہ اسے نہ بھلا سکا تھا اور اب جبکہ اس کے والدین اس کی شادی کا پروگرام بنا رہے تھے تو بھی اسے صرف آفرین ہی یاد تھی۔ وہ اسی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

سنی کے اس انکشاف نے خاندان میں اس سے شادی کے امیدواروں کی امیدوں پر گہری اوس ڈال دی۔ اس کے والدین کو اچنبھا ہوا کہ ان کا کم گو اور شرمیلا بیٹا اتنے برس اپنے بچپن کی محبت کو اس قدر راز داری سے دل میں چھپائے بیٹھا رہا تھا۔ ماں نے ہنس کر کہا۔ "سنی! میرے بیٹے..... وہ لڑکی تو اب نہ جانے کہاں ہو گی۔ تم اپنے خاندان ہی میں اپنی پسند ہمیں بتاؤ تاکہ ہم بسم اللہ کریں۔ وقت کم ہے، گھر بھی واپس جانا ہے۔"

"میں اسے تلاش کر لوں گا مم۔" سنی نے کہا۔

"کیسے؟"

"دنیا اتنی بڑی نہیں ہے مم۔" سنی کا جواب گول مول تھا۔

"دنیا بڑی نہیں گول تو ہے۔" ماں کا جواب سنی کے جواب سے بڑھ کر گول مول تھا۔

"کیا مطلب؟" سنی چونکا۔

"کوئی کنارہ ہاتھ میں نہ ہو تو آدمی گھوم پھر کر وہیں پہنچ جاتا ہے جہاں سے چلا ہوتا ہے۔"

"وہیں پہنچنے کی تو کوشش میں یہاں آیا ہوں۔" سنی نے کہا۔

ماں نے شانے اچکانے پر اکتفا کیا۔ وہ خاصی مایوس ہو رہی تھی۔ بڑا بیٹا اسکاٹش لڑکی کے چکر میں پھنس گیا تھا اور اب چھوٹا..... ایک ایسی لڑکی سے شادی کا متمنی ہو رہا تھا جس کا کچھ اتا پتا ہی نہ تھا۔

☆☆☆

اپنے بچپن کی محبت کی تلاش میں سنی اپنے سابقہ اسکول جا پہنچا۔ پرنسپل کی کرسی پر نیا چہرہ براجمان پایا۔ جونیئر ونگ کی نگراں بھی نئی تھیں۔ بہت سے پرانے اساتذہ ریٹائر ہو چکے تھے۔ زیادہ تر نئے تھے۔ آفس سپرنٹنڈنٹ کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ فوت ہو چکے تھے۔ کیشیئر بھی نیا تھا البتہ ایڈمن میں دو بابو ایسے تھے جنہیں سنی نے پہچان لیا۔ اللہ یار سولنگی اور عبدالرؤف۔ سنی نے ان سے اپنا تعارف سابق طالب علم کے طور پر کرایا۔ دونوں بہت خوش ہوئے۔ سنی کے کزن نے انہیں اعتماد میں لے کر اپنی آمد کے مقصد سے رازدارانہ انداز میں آگاہ کیا۔ دونوں مسکرائے پھر ایک نے کہا۔ "ہزاروں اسٹوڈنٹس آئے اور چلے گئے۔ اتنے لمبے عرصے بعد کسی کے بارے میں بتانا کہ وہ اب کہاں ہے، ممکن نہیں۔"

"مجھے یاد ہے ہماری کلاس انچارج حاضری رجسٹر میں ہر اسٹوڈنٹ کے گھر کا ایڈریس، والد کا آفس ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ بھی نوٹ کیا کرتی تھیں تاکہ کسی ضرورت کے تحت والدین سے رابطہ کرنے میں آسانی ہو۔ کیا پرانے رجسٹرز سے اس لڑکی کے گھر کا ایڈریس اور فون نمبر مل سکتا ہے؟"

"پرانے حاضری رجسٹر تو ایک مقررہ مدت بعد اسٹور میں جمع کرا دیے جاتے ہیں البتہ داخلہ رجسٹرز ہمارے دفتر ہی میں محفوظ رکھے جاتے ہیں اور ہر طالب علم کے وہ بنیادی کوائف جن کا آپ نے ذکر کیا، ہم داخلہ رجسٹر میں بھی درج رکھتے ہیں۔" اللہ یار سولنگی نے کہا۔

"پلیز مدد کیجیے..... بہت مہربانی ہو گی۔" سنی کے کزن نے کہا۔

"آپ کو اپنا داخلے کا سال یاد ہے؟" عبدالرؤف نامی بابو نے سنی سے پوچھا۔

"جی بالکل یاد ہے..... غالباً....." سنی نے ذہن پر زور دیتے ہوئے داخلے کا سن بتایا۔

بابو عبدالرؤف نے ایک پرانی الماری کھولی جس میں پرانے مجلد رجسٹرز عموداً ترتیب سے کھڑے تھے۔ رجسٹروں کو آگے پیچھے کر کے اس نے الماری سے دو رجسٹرز نکال کر اپنی میز پر رکھے اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر ایک رجسٹر کھولا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

UUNOVELS.COM

''اپنا داخلہ نمبر تو آپ کو یاد نہیں ہو گا؟'' بابو عبدالرؤف نے رجسٹر کے اوراق پلٹتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں۔''

خاصی دیر بابو رجسٹر کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھنے میں مگن رہا، پھر اس نے رجسٹر بند کر کے ایک طرف سرکایا اور دوسرا رجسٹر کھول لیا۔ چند اوراق پلٹے پھر ایک صفحے پر نظر دوڑاتے ہوئے اس پر ایک مخصوص مقام پر انگلی رکھ کر بولا۔

''عدنان رحیم کن آف عبدالرحیم۔''

''جی..... جی۔'' سنی جو بیم و رجا کی کیفیت میں تھا، پُرامیدی کے ساتھ سیدھا ہو بیٹھا۔

''وہ بھی اسی سال داخل ہوئی ہوگی۔'' بابو کا لہجہ قیاس اور استفسار دونوں کیفیات سے عبارت تھا۔

''جی..... شاید۔'' سنی بولا۔

بابو رجسٹر کی ورق گردانی میں مستغرق ہو گیا۔ سنی پھر بیم و رجا کی کیفیت سے دوچار دکھائی دینے لگا۔

''آفرین حیات فادرز نیم ڈاکٹر حیات نصیر شاہ۔'' بابو نے رجسٹر کے ایک صفحے پر اپنی دائیں انگشت شہادت کو انتہا حرکت دیتے ہوئے کہا۔

''او گاڈ..... تھینک یو۔'' سنی نے بے ساختہ کہا اور اپنے کزن کو دیکھا۔ سنی کا چہرہ یوں تمتما رہا تھا جیسے اسے دو جہان کا خزانہ ہاتھ آ گیا ہو۔

بابو نے قلم اٹھایا اور اپنی میز پر دھرا چکنی میں دبا کاغذ کا دستہ اپنے سامنے رکھ کر گاہے گاہے رجسٹر میں دیکھ کر کچھ لکھنے لگا۔ چکنی سے کاغذ کا دستہ نکال کر اس نے لکھا ہوا کاغذ دستے سے علیحدہ کیا اور سنی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ہو سکتا ہے ایڈریس اب یہ نہ ہو، بہرحال ہمارے ریکارڈ میں یہی ہے۔''

''تھینک یو ویری مچ..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' سنی نے بابو سے کاغذ لے کر کہا۔

''چھوٹے بڑے سب کی دعا چاہیے۔'' بابو نے کہا۔

''دعا کریں کہ لڑکی مل جائے..... آپ کو شادی میں ضرور بلائیں گے۔'' سنی کے کزن نے بابو سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''لگن سچی ہو تو اللہ ضرور ملاتا ہے۔'' بابو نے اِدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

سنی اور کزن ایک مرتبہ پھر نہایت گرمجوشی سے دونوں بابوؤں کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

دستیاب گوائف میں درج رہائشی پتے پر ڈاکٹر حیات نصیر شاہ کے بجائے کوئی اور شخص رہائش پذیر تھا۔ اس کے بقول اس سے قبل وہاں ڈاکٹر حیات نصیر نہیں، بلکہ جاوید احمد نامی کوئی شخص اپنی فیملی کے ساتھ مقیم رہا تھا۔ آس پاس آباد گھروں کے مکینوں سے البتہ یہ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر حیات نصیر تو عرصہ ہوا اپنے اہل خانہ کے ساتھ اسلام آباد شفٹ ہو گئے تھے۔ خوش قسمتی سے ایک پڑوسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ڈاکٹر حیات اسلام آباد کے ایک پوش سیکٹر میں کہیں پریکٹس کر رہے تھے۔ اس سے زیادہ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

سنی کے کزن نے اسلام آباد میں اپنے ذرائع سے ڈاکٹر حیات نصیر شاہ کا اتا پتا معلوم کرنے کے لیے اسلام آباد کے بیسیوں فون نمبرز گھمائے تب کہیں جا کر یہ معلوم ہوا کہ اس نام سے ایک ڈاکٹر ایک پوش سیکٹر میں اپنا مطب تو کر رہے تھے۔ مطب کا فون نمبر بھی مل گیا۔ سنی کے کزن کی رائے تھی کہ فون کر کے ڈاکٹر حیات سے بات کی جائے مگر سنی کو فون کرنا مناسب نہ لگا۔ اسلام آباد جا کر بنفسِ نفیس بات کرنا زیادہ مناسب تھا۔

سنی اور کزن اسلام آباد پہنچے۔ ڈاکٹر حیات نصیر کا مطب تلاش کیا۔ مطب بند تھا۔ مطب کی داخلہ گاہ پر ایک نوٹس چسپاں تھا۔ ''ڈاکٹر حیات نصیر شاہ دو ماہ کے لیے بیرونِ ملک گئے ہیں۔ اس دوران مطب بند رہے گا۔ مریضوں کو ہونے والی زحمت کے لیے معذرت خواہ ہیں۔''

سنی اور کزن نے مطب کے آس پاس سے ڈاکٹر حیات کی رہائش گاہ کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو پتا چلا ڈاکٹر حیات اپنے سسر کی کوٹھی میں رہائش رکھتے تھے جو اس سیکٹر ہی میں واقع تھی۔

سنی خوش ہوا کہ کڑیوں سے کڑیاں ملتی جا رہی تھیں۔ منزلِ مراد نزدیک ہی نظر آتی تھی۔

سنی اور کزن ڈھونڈتے ڈھانڈتے ڈاکٹر حیات کے سسر کی کوٹھی تک بھی پہنچ گئے۔ گیٹ پر موجود چوکیدار نے گھر کے اندر اطلاع پہنچائی اور صاحب خانہ کی اجازت پر انہیں گھر کے اندر آراستہ و پیراستہ بیٹھک میں لے جا بٹھایا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک خوش پوش بزرگ ان کے سامنے تھے۔

''ملک صفدر حسین۔'' بڑے میاں نے اپنا تعارف کرایا۔

''سر! میں فراز علی اور یہ میرے کزن عدنان رحیم..... ہم لوگ کراچی سے آئے ہیں۔'' سنی کے کزن نے اپنا اور سنی کا تعارف کرایا۔

''جی فرمایئے..... لیکن اس سے پہلے یہ بتایئے کہ

JUNOVELS.COM

آپ لوگ چائے لینا پسند کریں گے یا کافی؟''

''تھینک یو سر...... کچھ نہیں۔''

''ایسا کیسے...... آپ لوگ مہمان ہیں...... اتنی دور سے آئے ہیں۔''

''سر! ابھی چائے پی کر ہی نکلے ہیں۔''

''شیور؟''

''یس...... تھینک یو۔''

''جی...... فرمائیے...... کیسے آنا ہوا؟'' بڑے میاں نے پوچھا۔

سنی نے کزن کو دیکھا۔

''اِن فیکٹ سر...... ہم لوگ ڈاکٹر حیات نصیر شاہ صاحب سے ملنے آئے تھے۔ ان کے کلینک گئے تو پتا چلا وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔'' کزن نے کہا۔

''جی ہاں...... پچھلے ہفتے ہی گئے ہیں...... اکتوبر میں واپسی ہے...... میرے لائق کوئی خدمت؟''

''شکریہ سر...... اصل میں میرے یہ کزن باہر ہوتے ہیں...... انگلینڈ میں۔'' کزن نے سنی کے بارے میں بتایا۔ ''انہیں ڈاکٹر صاحب سے ملنا تھا۔''

''آئی سی...... بیٹا! ملاقات ہے آپ کی ان سے؟'' بڑے میاں کا روئے سخن سنی کی جانب تھا۔

''نہیں سر۔'' سنی نے کہا اور مدد طلب نظروں سے کزن کو دیکھا۔

''سر! ملاقات تو نہیں لیکن ایک تعلق ضرور ہے۔''

''میں اس تعلق کی نوعیت پوچھنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔'' بڑے میاں نہایت متانت سے مسکرائے۔

''لیکن میں بتانا ضروری سمجھتا ہوں...... اِن فیکٹ میرے یہ کزن اور ڈاکٹر صاحب کی صاحبزادی آفرین حیات پرائمری اسکول میں کلاس فیلوز رہے ہیں۔''

''اوہ!'' بڑے میاں اب کھل کر مسکرائے۔

''آفرین میری اکلوتی نواسی ہے اور ڈاکٹر حیات اپنی اہلیہ کے ہمراہ اسی سے ملنے کے لیے انگلینڈ گئے ہوئے ہیں۔ پچھلے سال ہم نے اس کی شادی کی ہے۔ اس کا ہسبینڈ بھی ڈاکٹر ہے۔''

سنی اور کزن نے ہڑبڑا کر ایک دوسرے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس طرح دیکھا جیسے ان کے آس پاس کہیں ایٹمی دھماکا ہوا ہو۔

''آفرین سے میری بات ہوتی رہتی ہے...... بتاؤں گا اسے آپ کے بارے میں...... عدنان رحیم...... یہی نام ہے نا آپ کا؟''

''جی......'' سنی نے پہلو بدلا۔

''آفرین کو آپ کے آنے کا پتا چلے گا تو وہ بہت خوش ہوگی۔ پرانے دوستوں سے مل کر وہ ہمیشہ خوش ہوتی ہے۔ کبھی ملیے اس سے...... آپ انگلینڈ میں کہاں ہوتے ہیں؟''

''کینٹ۔''

''کینٹ بہت خوب صورت ہے...... مجھے بہت پسند ہے...... آفرین سلاؤ میں رہتی ہے۔''

سنی نے چونک کر بڑے میاں کو دیکھا اور تنویمی سی کیفیت میں بڑبڑایا۔ ''سلاؤ......''

''جی ہاں...... اس کا ہسبینڈ وہیں جاب کرتا ہے۔''

''سلاؤ میری جائے پیدائش ہے۔'' سنی کو اپنی آواز میلوں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''اچھا!'' بڑے میاں متانت سے مسکرائے پھر بولے۔ ''حسنِ اتفاق!''

سنی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کزن سے اٹھنے کو کہا۔

''اجازت دیجیے۔'' کزن نے آفرین کے نانا سے کہا۔

''اتنی دور سے آئے ہیں...... مہمان نوازی کا موقع دیجیے۔''

''بہت شکریہ۔'' کزن نے کہا۔

''آج شام ہماری واپسی ہے۔'' سنی کے لہجے میں ہارے ہوئے جواری کی سی دل شکستگی تھی۔

''آپ کے آنے سے مسرت ہوئی۔'' بڑے میاں نے سنی کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے مزید کہا۔ ''پھر کبھی اسلام آباد آنا ہو تو ضرور آیئے گا۔''

''جی...... ضرور!'' سنی نے فقط اتنا ہی کہا۔

سنی اور اس کے کزن کی اسلام آباد سے بے نیل و مرام واپسی پر سنی کی ماں نے ساری کتھا سننے کے بعد سنی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم سلاؤ میں پیدا ہوئے تھے اور وہ شادی ہو کر سلاؤ آگئی...... کیسا عجیب اتفاق ہے۔''

''دنیا گول ہے بھئی۔'' سنی کے باپ نے کہا۔

سنی یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ اس کے باپ نے یہ بات مذاقاً کہی تھی یا معناً۔ بہرحال مذاقاً یا معناً اس بات سے تو سنی کیا کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ دنیا گول ہے۔

دنیا واقعی گول ہے اور گول گول گھومنے میں کوئی یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ کون کس کے پیچھے ہے اور کس کے آگے۔ بہرحال اب اسے ہر حال میں اپنا دائرہ مکمل کرنا تھا اور انہی میں سے کسی لڑکی کا انتخاب کرنا تھا۔

⌘⌘⌘

JUNOVELS.COM
JUNOVELS.COM

دکھائی نہ دیا، میں نے سکون محسوس کیا اور آگے چل دیا۔ ابھی میں کچھ دور ہی گیا تھا کہ جونی بائک لے کر آ گیا۔

''آ جا۔'' اس نے بائک میرے پاس روکی۔ میں پیچھے بیٹھ گیا اور ہم اپنے آفس کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں جونی نے کوئی سوال نہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس مشہور اداکارہ کے گیٹ پر سب کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوتا ہے جیسا میرے ساتھ ہوا تھا۔ میں نے راستے میں کہا۔

''جونی! لگتا ہے اس میڈم الینا کے لیے مجھے کسی پرائیویٹ جاسوس کا بندوبست کرنا پڑے گا۔''

''جاسوس سے کم تو تم بھی نہیں ہو لیکن اگر لازمی بندوبست کرنا ہے تو پھر میڈم کے سیکیورٹی گارڈ کے لیے کسی ہیوی ویٹ ریسلر کا انتظام کر۔'' میں اس کی بات سے متفق تھا۔ گارڈ پانچویں دفعہ مجھے ایسے ہی دھکا دے چکا تھا جیسے آج دیا تھا۔ یہ تو میری قسمت اچھی تھی جو ابھی تک کسی چوٹ سے محفوظ تھا۔

''اب باس کو کیا منہ دکھائیں گے؟ آج پھر ناکامی ہوئی ہے۔''

''یہی منہ دکھا سکتے ہیں، چہرہ بدلنے کا آپشن فی الحال ہمارے پاس نہیں ہے۔'' جونی نے سرد آہ بھر کر موسم کی ٹھنڈ میں اضافہ کیا۔ بائک آفس کے سامنے روک کر ہم اندر بڑھ گئے۔ باس حسبِ معمول لیپ ٹاپ سامنے رکھے خبریں دیکھ رہا تھا۔ ہمارے لٹکے ہوئے منہ دیکھ کر اس نے بغیر کوئی سوال کیے اپنی بات شروع کر دی۔

''سیاست کے حوالے سے کیٹگری میں آج میں نے تین خبریں لگا دی ہیں۔ کھیل کی خبریں بھی دلچسپ ہیں۔ اب رہ گیا شوبز تو اس حوالے سے ایک ہی اداکارہ ٹاپ پر ہے جس کی میں کوئی خبر نہیں لگانا چاہتا۔''

''کون؟'' ہم دونوں نے باس پیٹر کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

''ہے کوئی میڈم الینا۔''

''اس کی خبر کیوں نہیں لگانی؟''

''میرا خیال ہے وہ ہم جنس پرست ہے۔ اس لیے، مجھے ایسے لوگ پسند نہیں۔'' اس نے کندھے اچکا دیے۔ پیٹر پچاس سال کا تھا مگر ابھی تک خود کو جوان سمجھتا تھا۔ اس لیے اسے اکثر ایسی لڑکیوں سے چڑ رہتی تھی جو اس کے علاوہ کسی اور میں دلچسپی لیں۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر پیٹر کی طرف دیکھ کر جونی نے ہمارے خیالات کی ترجمانی کی۔

''ہم تو دو دن سے اس کے پیچھے تھے۔ چلو اچھا ہوا، کوئی خبر نہیں مل سکی اس کے حوالے سے..... نہ ہی وہ انٹرویو کے لیے راضی ہوئی ہے۔''

''تم دونوں ایسی ہی بیکار کوششوں کی وجہ سے نکمے کہلائے جاتے ہو۔'' پیٹر مسکرایا۔ ''اس نے آج تک کسی اخبار یا نیوز چینل کو انٹرویو نہیں دیا۔ ہماری اس نئی نویلی ویب سائٹ کو کیسے دے گی؟'' میں نے سر جھکا لیا۔ باس نے حقیقت بیان کی تھی۔ ''خیر، آج کے لیے میں نے کافی کام کر لیا ہے ادھر اُدھر سے تحقیق کر کے۔''

''چوری کر کے۔'' جونی کی بڑبڑاہٹ صرف مجھ تک پہنچی تھی اس لیے پیٹر کی گالیوں سے بچ گیا۔ ''اب تم دونوں سن لو، جونی! تم الینا کے علاوہ کسی بھی مشہور سیلیبریٹی کا انٹرویو لو گے، کسی بھی طرح۔ مارٹن! تم شوبز کے حوالے سے تمام خبریں دیکھو گے اس ہفتے کی۔'' میں نے سر ہلا دیا۔ اس کے ساتھ ہی پیٹر سے اجازت لے کر ہم باہر آ گئے۔

☆☆☆

پیٹر، میں اور جونی دوست تھے۔ اس کے باوجود کہ ہماری عمر اور مالی حالات میں واضح فرق تھا۔ پیٹر کاروباری شخص کا بیٹا تھا جس کا باپ اس کے لیے کافی ساری دولت برباد کرنے کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ اس کے ماضی سے میں اور جونی ناواقف تھے۔ اس نے بس اتنا بتایا تھا کہ محبت کی شادی میں ناکام ہونے کے بعد اس نے اپنا شہر چھوڑ دیا تھا اور یہاں آ بسا تھا۔

جونی اور میں کلاس فیلو تھے۔ ہمارے حالات اور خاندانی بیک گراؤنڈ تقریباً ایک جیسے ہی تھے۔ میں نے لاوارث بچوں کو پالنے والے ایک ادارے میں آنکھ کھولی تھی، والدین کون تھے، اس بات سے میں ناواقف تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں نے چھوٹی موٹی نوکریاں کیں پھر پیٹر کے کہنے پر اس کی ویب سائٹ جوائن کر لی۔

جونی کو اس کی ماں نے پالا تھا اور جیسے ہی وہ اٹھارہ سال کا ہوا، اسے لات مار کے گھر سے نکال دیا۔ ''بیٹا! خود کما اور کھا۔'' جونی کو ماں کے یہ الفاظ ہمیشہ یاد رہے۔ اس لیے اس نے جتنی بھی نوکریاں کیں، کمایا اور کھایا۔ کبھی گھر بنانے یا مستقبل کے لیے نہ سوچا۔ ہم دونوں ایک ایسی عمارت کے فلیٹ میں رہتے تھے جس میں توے فیصد غیر قانونی طور پر رہنے والے بستے تھے۔ اس لیے یہاں پولیس کی آمد ہوتی رہتی تھی۔ کچھ لوگ اسے پولیس کا سسرال بھی کہتے تھے جس سے میں اور جونی متفق تھے۔ یہاں صفائی اور نظم و ضبط جیسے الفاظ بے معنی تھے۔ مجھے اور جونی کو

JUNOWELS.COM

امید تھی کہ جلد پیٹر کی ویب سائٹ اتنے ممبر حاصل کرلے گی کہ ہم ماہانہ اچھی آمدنی کے ساتھ اپنا طرز زندگی بدل سکیں گے۔ یہ امید ابھی تک تو پوری نہیں ہوئی تھی البتہ پیٹر کی وجہ سے ہمیں اچھا کھانا پینا اور پہننے کو اچھا لباس مل رہا تھا۔

پیٹر کا آئیڈیا منفرد تھا۔ اس کے خیال میں دنیا رفتہ رفتہ پرنٹ سے الیکٹرانک ہوتی جارہی تھی اس لیے آن لائن نیوز کا کام جواب ذرا سست تھا، آنے والے دو سالوں تک عروج پر ہوتا۔ ویب سائٹ پر اشتہارات لگا کر وہ ان سے کمانا چاہتا تھا اور کامیاب ہوا بھی، ساتھ ہی اس نے ویب سائٹ پر باقاعدہ ممبرز بنانے شروع کردیے جس سے آمدنی ہونے لگی تھی۔ وہ خود محنت کررہا تھا اور پیسے بھی خرچ کررہا تھا۔ اس لیے اس کے کامیاب ہونے کی ہمیں بہت امید تھی۔

''یار مارٹن! میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔'' رات کو سونے کے لیے میں اپنے بستر پر لیٹا ہی تھا جب جونی آدھمکا۔ اس کی عادت تھی، وہ دماغ میں آنے والے ہر آئیڈیا اور خیال کو مجھ تک پہنچا کر دم لیتا تھا۔

''بھونک۔'' میری بات کا برا مانے بغیر وہ شروع ہوگیا۔

''الینا کا انٹرویو ایک اور ذریعے سے کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ اس طریقے سے میں دو انٹرویو کرلوں گا۔''

''کیسے؟''

''دیکھ، اب تک الینا کا کسی اداکارہ یا اداکار کے ساتھ کوئی اسکینڈل سامنے آیا ہے نہ ہی کچھ اور..... ہاں مگر اس کی ایک دوست ضرور ہے جو اس کے ساتھ ہر وقت جڑی رہتی ہے۔''

''کون..... روز؟'' میں چونکا۔ اس کی بات مجھے کچھ کچھ سمجھ آرہی تھی۔

''ہاں، وہی روز جو ہمارے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔''

''تو تم چاہتے ہو کہ روز کو پھنسا کر تم الینا تک پہنچو گے اور دونوں کا انٹرویو لو گے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''پر بیٹا تم ایک بات بھول رہے ہو۔ الینا کے انٹرویو سے ہمیں باس نے منع کیا ہے۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''ارے چھوڑ باس کو۔ الینا کے انٹرویو کو دیکھ کر للچا جائے گا وہ۔ کوئی عام چیز تو ہے نہیں، اس کے بارے میں بس اتنا علم ہے لوگوں کو کہ وہ کسی دوسرے شہر سے آئی ہے اور ماں باپ ہیں نہیں اس کے۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''چلو، کل روز سے ملنے کی کوشش کرو، اداکارہ تو وہ بھی ہے..... دیکھو ٹائم دیتی ہے یا نہیں؟''

''دے گی۔ میں تو یاد ہوں گا اسے۔'' روز کسی زمانے میں اس کی گرل فرینڈ رہ چکی تھی اس لیے اسے اعتماد تھا۔ اگلے دن اس نے مجھے کام پر بھیج دیا اور خود روز سے ملنے چلا گیا۔ میں شام کو واپس آیا تو وہ گھر نہیں پہنچا تھا۔ میں نے اسے کال کی مگر اس کا نمبر بند جارہا تھا، مجھے پریشانی ہوئی۔ رات گئے تک جب اس کا نمبر آن نہ ہوا تو مجھ پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی۔

''سو رہا ہوگا اس اداکارہ کی بانہوں میں۔'' میں بڑبڑایا۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ روز اور وہ پرانی یادیں تازہ کررہے ہوں گے۔ اس معاملے میں روز کھلے دل کی مالک تھی۔ بارہ بجے کے قریب مجھے نیند آگئی۔ میں سو کر اٹھا تو صبح کے دس بج رہے تھے۔ جونی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ میں نے پولیس سے رابطہ کرنے کا سوچا۔ ابھی میں پولیس کا نمبر ملانے لگا تھا کہ میرے موبائل کی بیل بجی۔ یہ کسی فون بوتھ کا نمبر تھا۔ میں نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ 'ہیلو' کے جواب میں دوسری طرف سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔

''میری بات دھیان سے سنو۔''

''کون؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارا باپ۔ کہا نا پہلے میری بات سنو۔'' وہ غرایا۔

''کرو بکواس۔'' مجھے لگا شاید کوئی رونگ کالر ٹنگ کرنا چاہتا ہے۔

''روز سے ملنا ہے تو وہ الینا کے گھر کی پچھلی جانب موجود ہے اور جونی میرے پاس ہے، اسے واپس حاصل کرنے کے لیے تمہیں میرے چند کام کرنے پڑیں گے۔ موبائل پاس رکھنا، میں دوبارہ کال کروں گا۔ پولیس کو اطلاع دی تو جونی کی لاش ملے گی۔ وہ بھی ٹکڑوں میں۔'' میرے ماتھے پر پسینا چمکا۔ ہاتھ کپکپانے لگے۔ مجھے ایک لمحہ بھی یہ سب مذاق نہیں لگا تھا۔ بولنے والے کے لہجے میں بلا کی سنجیدگی تھی۔ میں نے باس کا نمبر ملایا اور باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ خوش قسمتی سے جونی بائک نہیں لے گیا تھا۔ چابی میرے پاس تھی۔ کچھ دیر بعد بائک ہوا سے باتیں کررہی تھی۔

☆☆☆

''جب میں نے تم دونوں کو منع کیا تھا کہ الینا کا انٹرویو نہیں لینا پھر یہ بے وقوفی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' باس غصے میں ادھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ میرا اس چہل قدمی سے سر چکرانے لگا۔

''آپ ایک منٹ رک کر میری بات تو سنیں۔'' میں جھنجلا گیا۔

UUNOVELS.COM

''کیا سنوں تمہاری بات؟'' اس نے نظریں مجھ پر جمادیں۔ ''ایک وہ جونی جوادا کارہ کے چکر میں نہ جانے کس ڈان کے ہتھے چڑھ گیا ہے اور دوسرے تم جو مجھے یہاں اپنی بات سنانا چاہتے ہو۔''

''باس! جونی روز سے ملنے گیا تھا اور اس کے ذریعے وہ الینا سے ملنا چاہتا تھا۔ اب وہ غائب ہوا ہے اور کال کرنے والا یہ کہہ رہا ہے کہ روز، الینا کے گھر کی پچھلی جانب موجود ہے۔ تو ہمیں ابھی روز سے ملنا چاہیے تاکہ جونی کا سراغ معلوم ہو۔'' میں نے باس کو وہ سادہ بات سمجھانے کی کوشش کی جو وہ کافی دیر سے نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا جو اس بار اسے میری بات سمجھ آئی۔

''چلو چلیں۔'' اس نے کار کی چابی اٹھائی اور پارکنگ کی طرف چل پڑا۔ باہر غضب کی سردی تھی۔ چند دن پہلے ہونے والی برف باری کی وجہ سے سردی میں اضافہ ہوا تھا جس کے بعد اس موسم میں صرف دو قسم کے لوگ باہر نکلتے تھے۔ ایک کاروباری اور دوسرے ہم جیسے کوئی مجبور۔ باس نے کار موڑی اور الینا کے گھر کی طرف دوڑا دی۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں چالیس منٹ لگے تھے۔ یہاں اتنی زیادہ رونق نہ تھی۔ پُرسکون علاقہ تھا بس ایک دو آدمی دکھائی دیے۔ الینا کے گھر کے پیچھے تو بس ایک پارک تھا جس کے گیٹ پر ایک گاڑی کھڑی تھی۔ ہم نے اردگرد دیکھا، روز کہیں نہ دکھائی دی۔ اچانک باس کی نظر پڑی۔

''وہ دیکھو۔'' پارک کے گیٹ پر کھڑی الکوٹی گاڑی کے پیچھے روز نام کا اسٹیکر لگا ہوا تھا۔ ہم دونوں گاڑی سے نیچے اترے اور بھاگتے ہوئے اس جانب بڑھے۔ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے کوشش کی تو دروازہ کھل گیا۔ گاڑی لاک نہیں تھی، نہ ہی اس میں کوئی تھا۔

''یہاں تو کوئی نہیں۔'' میں نے باس کی طرف دیکھ کر نفی میں سر ہلا دیا۔

''مجھے تو یہ کوئی مذاق لگ رہا ہے۔'' باس نے سوچتی نظروں سے اردگرد دیکھا۔ یہی وقت تھا جب مجھے اچانک خیال آیا۔ گاڑی کی ڈکی ٹھیک سے بند نہیں تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے کھول دیا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھیں پھیل گئیں۔ روز کی لاش ڈکی میں موجود تھی۔ اس کے سر میں سوراخ ہو چکا تھا۔ اسے کہیں اور مار کر ڈکی میں پھینکا گیا تھا۔ باس کی حالت مجھ سے مختلف نہ تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور واپس اپنی گاڑی کی جانب دوڑ لگا دی۔

☆☆☆

''پولیس ہو یا کوئی اور..... تم نہ جونی کی گمشدگی کی بات کرو گے نہ ہی روز کی لاش کے بارے میں کسی کو کچھ بتاؤ گے۔'' باس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سمجھ گئے؟''

''پر باس..... وہ بلیک میلر؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''اس کو بھی دیکھ لیں گے، فی الحال تم یہاں سے فلیٹ پر جاؤ اور آرام سے رہو۔ اگر وہ کال پر کوئی بات کرے تو مجھے بتانا اور خبردار..... اگر میری لاعلمی میں کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' باس نے انگلی اٹھا کر مجھے وارننگ دی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور واپس فلیٹ پر لوٹ آیا۔ میرے دماغ میں کئی سوال گھوم رہے تھے جن کا جواب فی الحال میرے پاس نہ تھا۔ جونی کی گمشدگی کی پریشانی تھی۔ ہم کئی دنوں سے ساتھ تھے اور وہ میرے لیے سگے بھائیوں جیسا تھا۔ گھر پہنچ کر میں نے مشروب کا گلاس پیا جس کے بعد دماغ کچھ ٹھکانے آیا اور میری سوچوں کو ترتیب مل گئی۔ میں اب تک پیش آنے والے واقعات پر غور کرنے لگا۔ جونی روز سے ملنے گیا تھا جس کے بعد روز کی لاش ملی تھی اور جونی غائب تھا۔ نامعلوم کالر کا یہ دعویٰ تھا کہ جونی اس کے پاس ہے۔

''نامعلوم کالر کون ہو سکتا ہے؟'' میں بڑبڑایا۔ میرے دماغ میں ایک ہی نام گونج رہا تھا..... ''الینا۔'' یہ قصہ اسی کے انٹرویو سے شروع ہوا تھا اور اب اسی کے گھر کے پچھلی طرف ایک کار میں لاش موجود تھی جس سے صرف دو لوگ واقف تھے۔ خدا معلوم کب پولیس والے اس گاڑی تک پہنچتے اور لاش دریافت ہوتی۔ میں کچن کی طرف بڑھ گیا اور اپنے لیے کافی کا کپ تیار کرنے لگا۔ ٹھیک اسی وقت موبائل کی بیل بجی۔ میں نے دیکھا، یہ کسی فون بوتھ کا نمبر تھا۔

''ہیلو۔'' میری ہیلو کے جواب میں دوسری طرف وہی غراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''مسٹر مارٹن! روز کی لاش تو تم نے دیکھ لی ہوگی۔ اس کار کے ڈیش بورڈ میں کار کی چابی موجود ہے۔ وہاں دوبارہ جاؤ، کار کی چابی لو اور لاش لے جا کر شہر کے جنوب میں بہنے والے دریا میں پھینک دو۔ گاڑی وہیں کھڑی کر دینا۔''

''مگر کیوں؟''

''تمہارے پاس سوال کرنے کا حق نہیں ہے۔''

''میں اگر تمہارا کہنا نہ مانوں تو؟''

''جونی کا بازو کل میں پارسل کر دوں گا..... گڈ

بائے۔'' وہ کال کاٹنے لگا تھا کہ میں چیخا۔

''نن نہیں..... بالکل نہیں۔ میں جاتا ہوں۔''

''شاباش، جلدی جاؤ اور ہاں کسی اور کو ساتھ ملانے کی ضرورت نہیں ورنہ...'' اس 'ورنہ' کے بعد کے الفاظ کا مجھے علم تھا۔ کال کٹتے ہی میں دوڑا اور بائک اسٹارٹ کی۔ مجھے باس کو اطلاع کرنے کا ہوش نہیں رہا تھا۔ شدید سردی میں بھی بائک ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ گاڑی ابھی تک وہیں موجود تھی۔ میں نے ڈیش بورڈ سے اس کی چابی اٹھائی اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ اس کے ساتھ میں اسے موڑ کر سڑک پر لے آیا۔ شہر کے جنوب میں بہنے والا دریا بائیس تیئس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ میں نے گاڑی کی رفتار بڑھائی۔ بیس منٹ بعد میں وہاں موجود تھا۔ میں نے اردگرد دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے روز کی لاش ڈکی سے نکالی اور اٹھا کر دریا میں پھینک دی۔ آواز پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی میں نے گاڑی وہیں چھوڑ دی۔ اپنی انگلیوں کے نشان صاف کیے اور واپس پیدل چل دیا۔ تقریباً آٹھ کلومیٹر پیدل چلنے کے بعد مجھے لفٹ مل گئی جس سے شہر کی طرف سفر آسان ہو گیا۔

☆☆☆

''جب میں نے کہا تھا ہر بات کے بارے میں مجھے بتانا پھر کیوں نہیں بتایا تم نے بے وقوف؟'' پیٹر جھنجلایا ہوا تھا۔ اس نے مجھے چند مزید 'شاندار' الفاظ سے نواز کر دوبارہ کہا۔ ''کیا ضرورت تھی تمہیں اس اداکارہ کی لاش ٹھکانے لگانے کی؟ تم اس نامعلوم قاتل کی مدد کر رہے ہو۔'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''باس! اگر میں اس کی مدد نہ کرتا تو وہ جونی کو مار دے گا کیونکہ جونی اس کے پاس ہے۔''

''کیا ثبوت ہے کہ جونی اس کے پاس ہے؟'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ''اس نے تمہاری بات کروائی جونی سے؟'' میں سوچ میں پڑ گیا۔ باس کی دلیل مضبوط تھی۔ اب تک جتنی مرتبہ اس نامعلوم شخص سے کال پر بات ہوئی تھی، میری عقل جواب دے گئی تھی۔ میں نے اس سے کچھ پوچھا تھا، نہ ہی جونی سے بات کرنے کی ضد کی تھی۔

''اس نے اب تک جو کہا ہے سچ کہا ہے۔ جو روز کو مار کر اس کی لاش اسی کی کار میں رکھ سکتا ہے، وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں پولیس سے رابطہ کرنے لگا ہوں۔'' کچھ دیر سوچنے کے بعد پیٹر نے جواب دیا۔

''آپ ایسا نہیں کریں گے۔ اسے علم ہوا تو وہ جونی کو مار دے گا۔''

''مرنے دو جونی کو۔'' وہ چیخا۔ مجھے دکھ ہوا۔ جونی ہمارے لیے دوستوں سے بڑھ کر تھا۔

''آپ پولیس سے رابطہ نہیں کریں گے۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''میں کروں گا۔'' باس کے لہجے میں بھی ضد تھی۔

''یہ میرا اور جونی کا معاملہ ہے آپ دور رہیں۔ میں خود سب کچھ سنبھال لوں گا۔'' میں واپس مڑا۔ ''اب ہمارے راستے الگ ہیں۔ جونی میرا بھائی ہے اور اسے میں خود بچا لوں گا چاہے اس کے لیے مجھے کسی کی جان ہی کیوں نہ لینی پڑے۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ ''اس معاملے کی جڑ الینا ہے۔ میں اس تک بھی پہنچ سکتا ہوں۔''

''مارٹن رکو۔'' اس نے پکارا مگر میں نہیں رکا۔ میرا فیصلہ جذباتی تھا۔ مجھے ایسے معاملات یا مجرمانہ کارروائیوں سے نمٹنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ تجربہ باس کے پاس بھی نہیں تھا لیکن وہ مجھ سے عمر میں بڑا تھا اور یقیناً کوئی بہتر فیصلہ کر سکتا تھا مگر میرے لیے جونی کو بچانا ضروری تھا۔ میں پولیس سے رابطے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ واپس فلیٹ پر پہنچ کر میں نے پورے معاملے کو شروع سے ایک صفحے پر لکھنا شروع کر دیا۔ مجھے جب کسی معاملے کی سمجھ نہیں آتی تھی تو میں اسی طرح لکھ کر اسے سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ مجھے یہاں اپنی دو غلطیاں سمجھ آئی تھیں۔ ایک تو میں نفسیاتی طور پر بلیک میلر سے مرعوب تھا، دوسرا مجھے پولیس سے رابطہ کرنا چاہیے تھا۔ میں نے وہاں بیٹھ کر چند فیصلے کیے، اپنی جمع پونجی اکٹھی کی اور نکل پڑا۔ مجھے جونی کو بچانا تھا۔ اس کی جان خطرے میں تھی۔

☆☆☆

''جونی تین دن بعد تمہارے پاس ہوگا۔ تم تب تک فلیٹ سے باہر نہیں جاؤ گے۔'' اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ میرا دماغ گھوم گیا۔

''میری جونی سے بات کرواؤ ورنہ میں تمہاری کسی بات پر عمل نہیں کروں گا۔'' میں نے جواب دیا..... میری آواز کانپ رہی تھی۔

''تم مجھے دھمکی دینے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔'' اس نے سکون سے جواب دیا۔ ''تمہارے اور جونی کے لیے یہی بہتر ہے کہ تم میرا کہنا مانو ورنہ جس نے روز کو مار دیا اس کے لیے مزید دو قتل کرنا کوئی مشکل نہیں ہوگا۔'' میرے پورے

UUNOVELS.COM

جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔

''تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟'' مجھے اپنی آواز میں بے بسی محسوس ہوئی تھی۔

''میری مرضی۔'' یہ کہہ کر اس نے کال منقطع کر دی۔ میں نے گہری سانس لی اور جیکٹ کی جیب میں موبائل ڈال کر دونوں ہاتھوں کو آپس میں مسلنا شروع کر دیا۔ حرارت کے احساس نے سردی کی شدت کچھ کم کی تو میں نے قدم آگے بڑھا دیے۔ میں اس وقت الینا کے گھر کے پاس تھا۔ میں گھوم کر بنگلے کی پچھلی جانب آیا۔ یہ جدید ڈیزائن سے بنایا گیا گھر تھا جس کی طرز تعمیر میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن مجھے یقین تھا، پچھلی جانب سے اندر داخل ہونے کا کوئی راستہ ضرور ہوگا۔ مجھے علم تھا یہ میرا انتہائی قدم ہے جو ہو سکتا ہے مجھے پولیس اسٹیشن تک پہنچا دے مگر میرے پاس اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے راستہ مل گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جو لاک پڑا تھا۔ میرے لیے لاک کھولنا مشکل ثابت نہ ہوا کیونکہ میں پوری تیاری سے آیا تھا۔ میں نے ماسٹر کی آزمائی اور لاک کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ دروازہ کسی اسٹور روم کا تھا جس سے باہر نکلتے ہی مجھے آواز سنائی دی۔

''کون ہو تم؟'' اپنی خوش قسمتی پر مجھے یقین ہو چلا تھا کیونکہ میرے سامنے الینا کھڑی تھی۔ وہی الینا جس سے ملنے کی ہر کوشش ناکام ٹھہری تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور وہ اسکرین سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔

''مم..... میں۔'' اسی وقت میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ آنکھوں کے سامنے ستارے سے ناچ اٹھے اور میں لڑکھڑا کر نیچے گر گیا۔ اس کے بعد مجھے ہوش نہیں رہا۔ نہ جانے کتنی دیر بعد ہوش آیا تو میں ایک صوفے پر موجود تھا۔ میں نے سر کو ٹٹولا، گومڑ سا بن گیا تھا مگر میں زخمی ہونے سے بچ گیا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر نرم سی آواز نے بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا۔

''بیٹھے رہو۔'' الینا سامنے بیٹھی اپنے موبائل سے کھیل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی سیاہ فام ملازمہ میرے لیے کافی لے آئی۔ الینا کے ساتھ اس کا وہی سیکیورٹی گارڈ جو اکثر مجھے گیٹ سے بھگانے کا کام کرتا تھا، کھڑا تھا۔ اس نے اپنی مخصوص نظروں سے مجھے دیکھا۔ مجھے اپنے بے ہوش ہونے کی وجہ سمجھ آ گئی تھی۔

''تم چوری کرنے آئے تھے؟'' الینا نے پوچھا۔

''نہیں میم! یہ وہی پاگل ہے جو آپ کے انٹرویو کے لیے آتا رہتا ہے۔'' میرے بجائے سیکیورٹی گارڈ نے جواب دیا۔ الینا نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کیا۔

''میں نے تم سے نہیں پوچھا جارڈن۔'' اس کی عزت افزائی پر مجھے خوشی محسوس ہوئی۔ الینا نے دوبارہ مجھے مخاطب کیا۔ ''ہاں تو بتاؤ مسٹر نامعلوم۔ اس طرح گھر میں چوروں کی طرح گھس کر تم میرا انٹرویو لینا چاہتے تھے؟''

''نہیں میم! میں ایک انتہائی اہم سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم صاف الفاظ میں بتاؤ کیا چاہتے ہو ورنہ میں پولیس کو کال کرنے لگی ہوں۔'' اس نے موبائل پر نمبر ملایا۔

''میم پلیز! آپ کے بس چند منٹ لوں گا۔'' میں نے منت بھرے لہجے میں کہا اور اس کے ساتھ ہی میں نے جارڈن کو دیکھا۔ الینا میرا مطلب سمجھ گئی تھی۔ اس نے جارڈن کو اشارہ کیا۔

''تم باہر جاؤ اور دروازے پر کھڑے ہو جاؤ..... جیسے ہی میری آواز سنو تو فوراً اندر آ جانا۔''

''یہ آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے میم۔'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ اس لمحے میرے دل میں اس کے لیے موجود نفرت ضرب ہو کر ڈبل ہو چکی تھی۔ میں نے دوبارہ الینا کی طرف دیکھا اور پہلے کی نسبت اعتماد سے کہا۔

''ایسی کوئی بات نہیں میم! میں بس بات کرنے آیا ہوں۔ آپ مجھ پر اعتبار کر سکتی ہیں۔'' الینا نے کچھ دیر سوچا پھر جارڈن کو باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔ وہ مجھے گھورتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی الینا نے کہا۔

''ہاں بولو اب..... تمہارے پاس وقت کم ہے۔''

اس کی اجازت ملتے ہی میں نے بولنا شروع کر دیا۔ میں نے اسے جولی کے روز سے ملنے کے لیے آنے سے لے کر، روز کی لاش دریا میں پھینکنے اور بلیک میلر کی آخری کال تک مکمل کہانی سنا دی۔ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ شاید وہ خود روز کی کمی محسوس کر رہی تھی اور اس کا روز سے رابطہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ اس نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔

''میں نے اسے دو تین بار کال کی تھی مگر اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔''

''بس وہ خود بھی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی ہے اور میرے بھائیوں جیسے دوست کا بھی کچھ پتا نہیں چل رہا۔'' میں نے آہ بھری۔

''میرا خیال ہے تمہیں پولیس سے رابطہ کرنا چاہیے۔''

''میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔''

UUNOVELS.COM

''تم لے چکے ہو۔اس نے تمہیں گھر سے باہر نہ نکلنے کا کہا تھا اور تم یہاں موجود ہو۔''

''میرا خیال ہے وہ جو کوئی بھی ہے، میرے فلیٹ کی نگرانی کر رہا ہے اور آج میں چھپ کر نکلا ہوں۔'' میں نے فخر سے اسے بتایا۔یہی وقت تھا جب میرے موبائل پر میسج آیا۔ میسج پڑھتے ہی میرے ہاتھ کانپنے لگے۔موبائل میرے ہاتھ سے گر گیا تھا۔الینا نے گھبرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

''جونی کی لاش ملی ہے۔'' میری آواز کپکپا گئی۔میں اپنی بات مکمل نہیں کر سکا تھا۔میں نے اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپایا اور رونا شروع کر دیا۔نہ جانے کتنی دیر ایسے ہی گزر گئی۔الینا کی ملازمہ میرے لیے پانی لے آئی۔کچھ سنبھلنے کے بعد میں نے کہا۔''میرا خیال ہے مجھے اب جانا چاہیے۔'' میں کھڑا ہو گیا۔

''ایک درخواست ہے۔'' الینا نے نرم لہجے میں کہا۔

''کیا؟''

''پولیس کے سامنے میرا نام مت لینا..... کسی بھی صورت۔'' میں نے کچھ سوچ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔اس کے ساتھ ہی میں نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

یہ بالکل سنسان علاقہ تھا۔شہر سے باہر شاید ہی اس طرف کوئی آتا ہو۔جونی کو مرے کم از کم اڑتالیس گھنٹے گزر چکے تھے۔قاتل نے اس کی کھوپڑی میں کسی چیز سے کئی وار کر کے اسے موت کی نیند سلا دیا تھا۔اس کی لاش دیکھتے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے کئی مناظر گھوم گئے۔ پیٹر میرے ساتھ تھا۔اس کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔پولیس نے ہمارے بیان ریکارڈ کیے۔میں نے انہیں بس یہی بتایا کہ جونی کسی کام سے دو تین دن کے لیے غائب ہو گیا تھا۔پیٹر نے بھی بلیک میلنگ یا روز کے متعلق کچھ نہ بتایا۔لاش پوسٹ مارٹم کے لیے لے جائی گئی تو میں اور پیٹر اس کے گھر آ گئے۔اس نے کافی کا کپ میرے سامنے رکھا۔ہم کافی دیر خاموش بیٹھے رہے۔آخر اسے میری خاموشی سے الجھن ہونے لگی۔اس نے افسردہ لہجے میں بات شروع کی۔

''مارٹن! بھولنے کی کوشش کرو سب۔''

''میں نہیں بھول سکتا باس۔وہ میرا بھائی تھا۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''تو پھر کیا کر سکتے ہیں ہم؟ روز کی لاش کو تم نے ٹھکانے لگا دیا، اب اس کے پاس ثبوت بھی ہو گا کہ ہم جرم میں برابر کے شریک ہیں۔الینا سے مل نہیں سکتے جس کے ایک انٹرویو کی وجہ سے دو قتل ہو چکے، ایسے میں بے بس ہیں ہم۔''

''الینا کا انٹرویو یا اس کے گھر میں گھسنا اتنا بڑا جرم تو نہیں کہ کوئی اس کے لیے دو لوگوں کو مار دے۔آج نہیں تو کل روز کی گمشدگی کا معاملہ کھلے گا پھر بھی یہ سارا معاملہ سامنے تو آنا ہے۔ایسے میں کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے بیٹھنا کہاں کی عقل مندی ہے؟'' میں نے جواب دیا۔مجھے پیٹر پر بھی غصہ آنے لگا تھا۔وہ بجائے جونی کے قاتل کا کھوج لگانے کے، الٹا مجھے مشورے دینے لگ گیا تھا۔

''تم جذباتی ہو رہے ہو، حقیقت پسند بن کر حالات کا جائزہ لو۔پولیس ابھی تک اصل معاملے سے بے خبر ہے۔ ایسے میں اپنا بچاؤ کرو، کیوں اپنی جان خطرے میں ڈال

استطاعت

جب سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو بہت سے پرندے اپنی چونچوں میں پانی لے کر آگ بجھانے آئے۔ایک چیونٹی بھی اپنے منہ میں پانی بھر کر لے آئی تو پرندوں نے اس کا مذاق اڑایا کہ بی چیونٹی اتنے سے پانی سے بھلا کیا ہو گا تو چیونٹی نے جواب دیا کہ اس سے یہ ہو گا کہ روزِ قیامت میں اپنے پروردگار کی خدمت میں عرض کر سکوں گی کہ اے اللہ میں نے تو اپنی استطاعت کے مطابق تیرے خلیل کو آگ سے بچانے کی کوشش کی اور میرا رب کسی پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔لہٰذا نیکی کے کام میں اپنی استطاعت کے مطابق کوشش ضرور کریں اور نتیجہ اللہ رب العزت پر چھوڑ دیں۔

حسن اخلاق

خالق کی خوشنودی اور مخلوق میں ہر دلعزیز ہونے کے لیے اچھا اخلاق سب سے بڑا، سب سے بہتر اور سب سے آسان ذریعہ ہے۔انسان ہزار عالم و فاضل، عابد و زاہد ہو اگر وہ حسنِ خلق سے محروم ہے تو اس کا علم، عبادت و ریاضت سب ہیچ ہے۔اعتقادی طور پر انسان خواہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو لیکن انسان میں حقیقی جوہر اعلیٰ اخلاق کا ہونا بہت ضروری ہے۔

مرسلہ۔جاوید اختر رانا، حیدر آباد

JUNOVELS.COM

رہے ہو؟"

"میرا خیال ہے آپ کے یہ مشورے میں پہلے بھی سن چکا ہوں۔" میں کھڑا ہو گیا۔

"تم تب بھی میری بات نہیں مان رہے تھے اور دیکھ لو نتیجہ کیا نکلا۔" اس کے لہجے میں تلخی گھل گئی۔ میں پیٹر سے بگاڑنا نہیں چاہتا تھا مگر اس کی اور میری ذہنیت میں واضح فرق تھا۔ وہ مجھے سب بھولنے کا مشورہ دے کر چپ چاپ رہنے کا کہہ رہا تھا جبکہ میرے نزدیک یہ بزدلی تھی۔ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ میں الینا تک پہنچ چکا تھا، اس بات سے ابھی تک وہ بے خبر تھا۔ میرا دماغ فی الحال اس کی کوئی بات سمجھنے سے انکاری تھا اس لیے میں دروازے کی طرف چل دیا۔

"سوری پیٹر! پر ابھی یہ مشوروں کا وقت نہیں ہے۔"

"تم بے وقوف ہو۔" اسے غصہ آ گیا۔ وہ میرے پیچھے چلنے لگا۔ "جونی بھی بے وقوف تھا نہ جانے کس کے ہاتھوں مارا گیا۔ تم نے بلیک میلر کی ہر بات مان لی تھی پھر آخری بھی مان لیتے۔ نہ جاتے گھر سے باہر تو وہ جونی کو نہ مارتا۔"

"جونی کو وہ پہلے ہی مار چکا تھا۔" میں پھٹ پڑا۔ "مجھ پر الزام مت لگاؤ۔ جونی کو مرے اڑتالیس گھنٹے ہو چکے تھے۔"

"تم اب کچھ نہیں کرو گے۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کی گرفت سخت تھی۔

"مجھے الینا تک پہنچنا ہے۔ یہ سارا معاملہ اسی سے شروع ہوا تھا، اسی پر ختم ہو گا۔" یہ کہہ کر میں واپس مڑا اور باہر چل دیا۔ پیٹر چپ چاپ وہیں کھڑا رہا۔ میرا رخ خود بخود الینا کے گھر کی طرف ہو گیا۔ وہاں گیٹ پر حسب معمول جارڈن کھڑا تھا۔ اس نے مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھا۔ نہ جانے کیوں اس کی مسکراہٹ میں مجھے طنز دکھائی دیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہا ہے۔

"کدھر گھوم رہے ہو مسٹر مارٹن؟" اس کی آواز سنائی دی۔

"مجھے میم سے ملنا ہے۔"

"بھول جاؤ، میڈم نے سختی سے منع کیا ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں جاؤں گا۔"

"دفع ہو جاؤ ورنہ۔"

"ورنہ کیا؟ قتل کر دو گے مجھے..... جیسے میرے دوست کو کیا تھا؟" وہ چونکا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"بکواس بند کرو۔" وہ غرایا۔

"میں سب جانتا ہوں جارڈن، تم نے ہی جونی کو مارا ہے اور بلیک میلر بن کر کال کرتے رہے ہو مجھے۔ آواز پہچان گیا ہوں میں تمہاری۔" اب کی بار وہ ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی مجھے کھوکھلی محسوس ہوئی۔

"جاؤ ثابت کرو، نکلو اب۔" اس نے مجھے جانے کا اشارہ کیا۔

"ثبوت مل جائیں گے جلد۔" میں نے دھمکی دی اور باہر آ گیا۔ واپس اپنے فلیٹ میں پہنچ کر میں نے تیزی سے کچھ چیزوں کا بندوبست کیا۔ مجھے یقین تھا کہ آج کی رات اہم ہے اور یہ کیس حل ہونے والا ہے۔ رات تقریباً بارہ بجے میرے فلیٹ کا دروازہ کھلا۔ میں نے جان بوجھ کر لاک نہیں لگایا تھا۔ جیسے ہی آنے والا اندر داخل ہوا، میرے ہاتھ میں موجود ہاکی اس کے سر پر پڑی۔ وہ نیچے گر گیا۔ میں نے اسے گھسیٹ کر صوفے پر ڈالا اور لائٹ جلا دی۔ اس کے سر سے خون نکل آیا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پیر باندھے اور سر پر پٹی باندھ دی۔ اس کے منہ پر ٹیپ لگا کر میں باہر آ گیا۔ اب مجھے کم از کم دو دن گھر سے باہر رہنا تھا۔

☆☆☆

اس شہر میں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں بس یہی سوچ کر آیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح کھوج لگا لوں گا۔ مجھے زیادہ وقت نہیں لگا۔ پہلے دن کی شام ہی مجھے کھوج مل گیا تھا۔ دوسرے دن چند سوڈا الرز جو میں نے بُرے وقت کے لیے بچا رکھے تھے، وہ کام آ گئے اور ایک بڑھیا کی جیب بھرنے کے بعد مجھے اپنی مطلب کی تمام معلومات مل گئیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے واپس اپنے شہر کا رخ کیا۔

اتوار کی شام تھی جب میں نے اپنے فلیٹ میں قدم رکھا۔ بیگ دور پھینک کر میں نے اپنے شکار کی طرف دیکھا۔ وہ نڈھال ضرور تھا مگر ابھی تک زندہ تھا۔ میں نے اس کے منہ سے ٹیپ ہٹائی۔ اس نے بولنے کی کوشش کی مگر اتنی طاقت اس کے پاس نہ تھی۔ میں نے برگر نکال کر اس کے منہ کے پاس کیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ وہ بے تابی سے کھانے لگا۔ بھوک مٹنے کے بعد اس نے پھر مجھے دیکھا۔ میں نے جیب سے برانڈی کی بوتل نکال کر اس کے منہ سے لگا دی جسے وہ ایک سانس میں چڑھا گیا۔ اب وہ ہانپ رہا تھا۔

"اب بتاؤ، کیوں مارا ان دونوں کو؟"

"تم اچھا نہیں کر رہے مارٹن، میں نے کسی کی جان نہیں لی۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا مگر مجھے یہ بتا دو آخر تم ان

UUNOVELS.COM

دونوں کو میڈم الینا سے دور کیوں رکھنا چاہتے تھے؟"

"میں کیوں دور رکھوں گا کسی کو؟ وہ خود کسی سے نہیں ملتی۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ جھنجلایا ہوا تھا۔

"تمہیں پتا ہے میں نے دو دنوں میں کیا معلومات اکٹھی کی ہیں؟"

"کیا؟" وہ چونکا۔

"میں اس سیاہ فام ملازمہ میری تک پہنچ گیا ہوں اور اس نے مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے۔" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور میرے لہجے میں موجود سچائی کو محسوس کیا۔ وہ جنون میں آگیا تھا۔ اس نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھ پاؤں کھولنے کی جنونی کوشش کی، وہ مجھ پر جھپٹنا چاہتا تھا۔

"تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔" وہ چیخا۔ وہ مکمل بے بس ہو چکا تھا۔

"مجھے حقیقت بتا دو۔"

"وہ میری بیٹی ہے۔" تھک کر اس نے ہار مان لی۔

"یہ میں جان چکا ہوں۔ وہ بیٹی نہیں ہے، نہ بیٹا ہے۔"

"ہاں ہاں، وہ تیسری جنس سے تعلق رکھتی ہے۔" وہ غصے میں چیخا۔ "یہی بات چھپانا چاہتا تھا میں، اسی وجہ سے اس کی ماں چھوڑ گئی مجھے۔ وہ میری محبت تھی۔" اس نے سر جھکا لیا۔ پیٹر بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ ذہنی طور پر تباہ ہو چکا تھا۔ کافی دیر رونے کے بعد وہ کچھ سنبھل گیا۔

"تم نے جونی اور روز کو کیوں مارا؟"

"روز اس کی سہیلی تھی۔ میں نے اتفاق سے جونی اور اس کو اکٹھا دیکھ لیا تھا۔ میرے دماغ میں یہ سوچ بیٹھ گئی کہ وہ دونوں اس کا راز فاش کر دیں گے۔ نام کی دوست تھی روز، حقیقت میں خود ناکام اداکارہ تھی اور اس کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ میرے، میری بیوی اور میری کے علاوہ اس کے راز سے روز واقف تھی۔ شک کی بنیاد پر میں نے دونوں کو اغوا کر لیا۔ روز کو مار کر وہیں پھینک دیا اور جونی کو ایک دن بعد مارا تھا جب اسے میری شناخت ہو گئی تھی۔" اس نے تفصیل بتائی۔

"لاشوں کو تم خود ٹھکانے لگا سکتے تھے پھر مجھے کیوں بلیک میل کیا؟" میں نے پوچھا۔

"وہی شک جو میرے دماغ میں بیٹھ گیا تھا۔ تم جونی کی گمشدگی کے بعد یقیناً اس تک پہنچنے کی کوشش کرتے، اس لیے تمہیں خوفزدہ کرنے کے لیے میں نے یہ کھیل کھیلا۔"

"آج نہیں تو کل یہ راز کھل جاتا پھر الینا کی فیلڈ ہی ایسی ہے کہ یہاں کچھ راز نہیں رہتا پھر تم کیوں اتنے جنونی ہو گئے؟" میں نے دکھ سے اسے دیکھا۔

"بس۔ اپنی زندگی میں اسے بدنام ہوتا دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔" اس نے چہرے پر افسردہ سی مسکراہٹ سجائی۔ "الینا ہماری پہلی اولاد تھی اور اس کا دکھ بہت بڑا تھا۔ دنیا جتنی مرضی ترقی کر لے ایسی جنس کو قبول کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بیوی نے مجھے چھوڑ دیا تو الینا کو پالنا مشکل تھا اس لیے میں نے چپ چاپ اسے میری کو دیا اور خود شہر چھوڑ دیا۔ اس کی خبر لیتا رہا اور اس کا سارا خرچ اٹھایا۔ یہاں تک کہ وہ اداکاری سیکھ کر اس میدان میں آگے بڑھ گئی۔ اسے علم تھا کہ میں یہاں ہوں مگر کبھی نہ اس نے ملنے کی کوشش کی نہ میں نے۔ بس غیر ارادی طور پر میں اسے بچانا چاہتا تھا۔ شاید اولاد کی محبت تھی جو دوری کے باوجود شدت اختیار کر گئی اور آج میں ہار گیا۔" اس کی آنکھوں میں دوبارہ نمی اتر آئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور پولیس کے دو آفیسر اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پاؤں کھول کر ہتھکڑی لگا دی۔ فلیٹ میں خاموشی چھا گئی تھی۔ میں نے چند لمحوں کی اس خاموشی کو توڑا۔

"تم نے بہت غلط کیا پیٹر۔"

"میں مجبور تھا۔ ایک سوال کا جواب دو۔"

"پوچھو۔"

"تمہیں مجھ پر شک کیسے ہوا؟"

"تمہاری پلاننگ اچھی تھی اور جذبات برے۔ جب آخری بار میں تم سے لڑ کر باہر جا رہا تھا تو تم نے مجھے کہا تھا کہ بلیک میلر نے مجھے فلیٹ سے باہر نہ نکلنے کا کہا تھا جس پر میں نے عمل نہیں کیا اور اس نے جونی کو مار دیا۔" میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "میرے دوست یہ بات تو میں نے تمہیں بتائی ہی نہیں تھی۔" اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ اس نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بہت معمولی غلطی تھی یہ۔"

"ہاں۔ بس یہیں سے مجھے شک ہوا تو تمہارے رویے کی سمجھ آگئی۔ میں نے پھر جان بوجھ کر تمہارے سامنے الینا سے ملنے کا کہا اور وہاں گیا بھی اور اس کے بعد لوٹ آیا۔ تم مجھے بھی مارنے پر مجبور ہو گئے اور یہاں تک پہنچ گئے۔ نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔" میں نے کندھے اچکا دیے۔ پولیس اسے لے کر چلی گئی۔ فلیٹ میں خاموشی چھا گئی۔ اب اس خاموشی کو توڑنے والا کوئی نہیں تھا۔

⌘⌘⌘

UUNOVELS.COM

کربِ نارسائی

کاوش صدیقی

کم عمری کے خواب ہوں یا خواہش... ہمیشہ کے لیے ذہن کے کسی نہ کسی کونے میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں اور وقفے وقفے سے اپنے ہونے کا احساس دلا کر دل میں ایک چبھن سی پیدا کرتے رہتے ہیں بالخصوص چاہت پانے کی تمنا میں خالی ہاتھ رہ جانے والے عموماً دل گرفتگی کے غم میں اپنے آس پاس بکھری محبتوں سے غافل رہتے ہیں۔ وہ بھی اسی غفلت میں اپنی شریکِ زندگی سے بے خبر بس ایک سائے کے مانند ساتھ نباہتا رہا تھا اور یہ بھول گیا کہ... محبت ہو یا نفرت ایک نہ ایک دن اپنے ہونے کا احساس ضرور دلاتی ہے لیکن اس کرب کا کون اور کیسے مداوا کرے جب احساس جاگ جانے پر انسان اپنے چاروں طرف محض تنہائی کا تماشا دیکھے اور کوئی اس کے زخموں پر مرہم رکھنے والا ہی نہ ہو۔

اچانک کی خاموشی سے زندگی سے نکل جانے والی شریکِ زندگی کی دلفگار داستان

URNOVELS.COM

جب مجھے پہلی بار محبت کا احساس ہوا تھا تو اس وقت میری عمر کا سولہواں سال چل رہا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ بے چینی، کلبلاہٹ، الجھن اور کسی کو دیکھتے رہنے کو جی چاہنے کا مطلب محبت ہوتا ہے۔

وہ اچھے دن تھے جب محبت کا مطلب دیکھنا، تڑپنا اور بالآخر بچھڑ جانا ہوتا تھا۔ تب پہلی بار نذیر نے کہا۔ ''یار! تو بس اسی کھڑکی کی طرف دیکھتا رہتا ہے، میری طرف بھی تو دیکھ ذرا.....'' وہ لڈو سجائے بیٹھا تھا۔

میں سامنے والی کھڑکی میں دھیان لگائے ہوئے تھا۔

''نہیں..... نہیں۔'' میں نے ہڑبڑا کے کہا۔ ''میرا تو سارا دھیان ہی تیری طرف ہے۔ یہ لے تیری گوٹی پک گئی آیا میرا چھکا۔''

میں نے جلدی سے دونوں چھکے چھن چھن کی آواز سے ہلائے۔

''تجھے تو یاد ہی نہیں کہ باری تیری نہیں میری ہے.....'' نذیر نے مجھے غور سے دیکھا۔

''ابے تو کیا ہوا..... تو چل لے.....'' میں نے نذیر کی طرف دیکھا اور چھکے والی ڈبیا اس کی طرف بڑھائی۔ تب ہی جیسے کسی لاسلکی تعلق سے بندھے میں نے گردن اٹھائی اور سامنے کھڑکی میں دیکھا۔

وہ کھڑکی میں کھڑی ہماری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ میرا سارا دھیان لڈو سے پلٹ کر کھڑکی میں کھڑے نسوانی وجود کی طرف منتقل ہو گیا۔

''تو نہیں سدھرے گا.....'' نذیر نے مایوسی سے کہا اور لڈو کی ڈبیا رکھ دی۔

''اب کیا ہوا؟'' میں نے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تیرا سر۔'' نذیر نے غصے سے کہا۔ ''میں سمجھ گیا تو اب ہاتھوں سے نکل گیا۔'' اس کے انداز میں فکرمندی تھی۔

ہماری نگاہیں ملیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر کھڑکی بند ہو گئی۔

میں ایک گہری سانس لے کر افسردہ ہو گیا۔ میرا منہ لٹک گیا۔

''میں کیا کروں یار..... جی چاہتا ہے بس اسے دیکھتا رہوں۔ دیکھتا رہوں اور پھر اسے سوچتا رہوں۔ حالانکہ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''ابے تجھے محبت ہو گئی ہے۔'' نذیر نے میری حالت کا تجزیہ پیش کیا۔

''لے بھلا ایسے بھی کوئی محبت ہوتی ہے؟'' میں نے اس کے خیال کی نفی کی پھر مزید کہا۔

''نہ ہی ہم ملتے ہیں، نہ باتیں کرتے ہیں۔ میں تو اس کا نام تک نہیں جانتا۔''

''ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی پیر میں کانٹا چبھا ہوا ہے جو نکالنے پر بھی درد کرتا رہتا ہے۔ پھر چبھن سارے دل میں پھیل جاتی ہے۔'' نذیر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

میں نے تعجب سے نذیر کو دیکھا۔ وہ بہ مشکل تین چار سال مجھ سے بڑا ہو گا لیکن بعض باتوں میں اس کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ میں ایک گھریلو سا لڑکا تھا جس کو سوائے اسکول آنے جانے اور اپنے تمام تر وقت کا حساب کتاب اماں کو دینا ہوتا تھا۔ جبکہ نذیر کھلا ڈلا لڑکا تھا۔ جب اس کا جی چاہتا باہر نکل جاتا..... گھر آ جاتا۔ نذیر کا باپ کباڑیے کا کام کرتا تھا۔ نذیر کبھی اس کا ہاتھ بٹاتا اور کبھی گھر کی بیرونی بیٹھک میں بڑے سے تخت پر بیٹھا لڈو، تاش یا کیرم سجائے رکھتا۔ محلے کے لڑکے بالے سب اس کے دوست تھے۔

اس کی تمام سطح پر معلومات بے حد وسیع تھیں۔ کم از کم میرے نزدیک تو نذیر ایک ایسا انسائیکلو پیڈیا تھا جس میں جہان بھر کی معلومات جمع تھیں۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تُو، تو ہاتھ سے گیا پیارے۔'' اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''اس میں تیرا قصور بھی نہیں ہے، وہ تو ہے ہی پٹاخہ۔''

نہ جانے کیوں مجھے برا لگا۔ ''یار! میں تو بس اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''یہی محبت ہے پیارے۔'' نذیر نے کہا۔ ''میرا یار اب مجنوں کلب میں داخل ہو گیا ہے۔''

''مجنوں کلب؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''یہ کونسی جگہ ہے؟''

''یہ دل والوں کا ٹھکانا ہے پیارے! جہاں لیلیٰ، مجنوں، شیریں فرہاد سارے عاشق جمع ہوتے ہیں۔''

''ہوں.....'' میں نے کندھے اچکائے۔

تاہم مجھے اپنے دل کی بے چینی کا مسلسل سبب معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے کھڑکی والی سے پیار ہو گیا تھا۔ اس سے جس کا نام تک مجھے معلوم نہیں تھا اور جنہیں ابھی محلے میں آئے ہوئے زیادہ دن بھی نہیں ہوئے تھے۔

☆☆☆

رات کو اچانک آنکھ کھل جانا، پھر سوچ کے سفر کا

UUNOVELS.COM

کھڑکی میں سجے چہرے تک رک جانا، بڑی عجیب سی بات تھی۔ پہلے میں گھوڑے بیچ کے بے خبر سوتا تھا۔ بقول اماں کے اس کو تو صور اسرافیل ہی جگائے گا مگر اب ہلکی سی آہٹ پر آنکھ کا کھل جانا..... کیا ہو گیا تھا مجھے؟

پھر مجھے یاد آتا کہ میرے مرض کی تو تشخیص ہو چکی ہے۔ نذیر نے نہایت وثوق سے میری بیماری کا نام پیار بتایا تھا۔

باہر سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور کمرے میں ملگجا اندھیرا تھا۔

کمرے کی کھڑکی بند تھی، بیرونی کمرے میں اماں سوتی تھیں اور ان کے ساتھ میرے دو چھوٹے بہن بھائی۔ ہم اور بھائی پچھلے کمرے میں سوتے تھے۔ بقول اماں کے جب اولاد جوان ہونے لگے تو پہرا سخت کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ جوانی دیوانی کوئی بھی گل کھلا دیتی ہے اور پھر بندہ ہی نہیں پورا گھر ہی سیاپے میں پڑ جاتا ہے۔

مگر میری تو ابھی جوانی بھی نہیں آئی تھی اور مسیں بھی پوری طرح بھیگی نہیں تھیں، اور میں پیار کے سیاپے میں پڑ گیا تھا اور اماں کی ساری احتیاطیں دھری کی دھری رہ گئی تھیں۔

اماں بڑے بھائی کی طرف سے چوکنا تھیں۔ وہ مجھ سے زیادہ خوش شکل، خوش بدن اور ہمسوڑ تھا۔ اماں کا خیال تھا کہ ایسے لڑکے پر لڑکیاں تو لڑکیاں جنتیاں بھی عاشق ہو جاتی ہیں مگر میں جو دبوسا، ڈرپوک سا تھا..... گل کھلا بیٹھا تھا۔ اپنے من میں اور بقول مجھ سے چھوٹی بہن۔ ''اماں دیکھنا یہ بڑا میسنا ہے۔ گل یہی کھلائے گا۔''

مگر اماں اسے گھورتیں اور سخت لہجے میں تنبیہہ کرتی تھیں۔ ''خبردار جو فضول بکواس کی تو نے۔ میرا بیٹا تو بڑا معصوم سا ہے۔ اس کو تو کتاب کاپیوں کے سوا کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔ یہی خاندان کا نام روشن کرے گا۔''

ہمارا خاندان خاصا کھاتا پیتا تھا۔ دو مکان کرائے پر چڑھے ہوئے تھے۔ ابا کا سبزی منڈی میں آڑھت کا کاروبار تھا۔ وہ رات ڈھائی تین بجے جاتے تھے اور صبح نو بجے تک ایک میلے سے تھیلے کو لٹکائے چلے آتے جس میں بہت سارے نوٹ بھرے ہوتے۔

اماں ہمیشہ ان کی اس حرکت پر نالاں رہتی تھیں۔ ''دیکھو بھلا..... اس طرح روپیا لے کر آتے ہو، کسی نے چھین لیا تو پھر کیا کرو گے؟''

ابا جواب دیتے۔ ''نیک بخت! لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ روپے بڑے محفوظ طریقے سے رکھتے ہیں۔ میں تو اس میلے سے تھیلے کو سائیکل کے اسٹینڈ پر سبزیوں کے ساتھ باندھ لاتا ہوں۔ کسی کو کیا پتا آلو پیاز کا یہ تھیلا ہزاروں کا ہے۔'' ابا خوش دلی سے قہقہہ لگاتے اور تھیلا اماں کو پکڑا دیتے۔ ابا کو اماں سے بہت پیار تھا۔

بقول ابا۔ ''تم سے شادی کے بعد ہی میری قسمت بدل گئی ورنہ میں تو آلو پیاز کا تھیلا لگائے گلی گلی پھرتا تھا اور پھر اسی دھندے میں تم مل گئیں۔''

اماں فخریہ مسکراتیں۔ ''اب یہ تو تمہاری قسمت تھی کہ ہم سے شادی ہو گئی۔ ورنہ ہمارے ابا نے بشیر کریانہ مرچنٹ کے حمید اللہ سے شادی کا ارادہ کیا ہوا تھا مگر قسمت تو تم سے جڑی تھی۔''

ابا ہنستے۔ اماں کا قہقہہ گھر میں گونجتا۔

مجھے بہت اچھا لگتا اور میں سوچتا ابا اماں کی محبت کی یہ کہانی کیا میری زندگی کی کہانی بن سکے گی؟ کیا مجھے بھی کوئی ایسی لڑکی رستے میں آتے جاتے ملے گی جس سے آنکھیں چار ہوں گی اور میں بھی ابا کی طرح قسمت والا ہو جاؤں گا۔

ابا، اماں کی محبت کی یہ کہانی ہم سب بہن بھائیوں کو ازبر تھی کیونکہ یہ تقریباً ہر روز دہرائی جاتی۔

ہم بھی صبح کے شو میں ہنستے اور خوش ہوتے۔ مجھے یہ منظر سب سے زیادہ دیکھنے کو اس لیے ملتا تھا کہ میں صبح کے بجائے دوپہر کے اسکول میں جاتا تھا۔ میرے دوپہر میں اسکول جانے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مجھ سے صبح اٹھا ہی نہیں جاتا تھا۔ لاکھ پٹنے گالیاں کھانے اور بالٹی بھر پانی پھینکنے کے باوجود اماں نے تھک ہار کے مجھے دوپہر کے اسکول میں داخل کرا دیا کہ چل نیند کے مارے اب تو جاہل نہ رہ جانا۔

ابا خوش مزاج تھے۔ گھر کا ماحول خوش گوار تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہمارے گھر میں غربت نہیں تھی ورنہ میرے دوست سلیم کے گھر روزانہ چخ چخ ہوا کرتی تھی اور اس کی بنیادی وجہ سلیم کے ابا کی کم تنخواہ اور سات بچے تھے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب یہ جملہ عام نہیں ہوا تھا۔ ''جب کھلا نہیں سکتے تو پیدا کیوں کرتے ہو۔''

بلکہ بچوں کی پیدائش کو نعمتِ خداوندی گردانا جاتا تھا جس کی بنیادی وجوہات میں تفریح کے محدود ذرائع اور غربت تھی۔ لے دے کے جو تفریح کا واحد ذریعہ بچتا تھا، اس میں پھر یہی ہوتا تھا۔ ''بہت سے بچے۔ بہت سی غربت۔''

ہمیں یہ ساری رنگ کنٹری براہِ راست سننے کا مسلسل موقع حاصل تھا۔ اس کی وجہ سلیم کے گھر کا ہمارے گھر سے

UUNOVELS.COM

متصل ہوتا تھا۔

اکثر جب کافی لڑائی جھگڑا ہو چکتا تو اماں صحن کی دیوار کے ساتھ لگی سیڑھی پر چڑھ کر سلیم کی اماں کو آواز دیتی تھیں۔

''ارے بشیرن! کہاں ہو؟''

''ارے، میں کہاں جاؤں گی..... یہیں مر رہی ہوں۔'' بشیرن اندرونی کمرے سے لپک کر آتے ہوئے کہتی۔

''یہ لو سبزی بنالو۔ آج بینگن بہت اچھے ہیں۔ نئی فصل کے ہیں اور ہاں..... اس کے ساتھ دھنیا، مرچیں اور ٹماٹر بھی ہیں۔ ذرا ساچٹ پٹا بنانا اور دیکھو، مجھے بھی دینا۔ ویسے تو تم بھرتا اچھا بناتی ہو۔''

اماں ہنس کر کہتیں' ان کے انداز میں کسی احسان کا شائبہ تک نہیں ہوتا تھا۔

''شکریہ باجی!'' بشیرن خالہ بڑی ممنونیت سے کہتیں اور سبزی تھام کے اپنے اسٹول سے اتر جاتی تھیں۔

ان دنوں ہر بڑی خاتون چاچی یا خالہ ہوتی تھی اور ہر مرد کے لیے عورت بہن کے لقب سے سرفراز ہوتی تھی اور پھر کبھی کبھی بڑے ہو کر یہی غیر بہن بچوں کی اماں بھی بن جاتی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب میرج بیورو نہیں تھے مگر رشتوں کا کال نہیں تھا اور عموماً لڑکے لڑکیوں کی شادی اپنے وقت پر ہو جاتی تھی۔

''کیا بات ہے، کیا سوچ رہے ہو؟'' اماں نے مجھے گم صم بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔ وہ سبزی کاٹ رہی تھیں۔

''کچھ نہیں، بھوک لگ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو چپ کیوں بیٹھا ہے، مجھے بول دیتا۔ دو منٹ میں ناشتا بنا دیتی ہوں۔ رات کی سبزی سے روٹی کھاؤ گے یا پراٹھا؟ آلو کے بھرتے سے مزے کا لگے گا۔'' اماں نے فوراً ہی سبزی کے برتن اور چھری علیحدہ رکھ دیے۔

''پراٹھا بنا دیں۔'' میں نے فوراً کہا۔

''جاؤ ہاتھ منہ دھو لو۔''

اماں کا موڈ اچھا تھا یا میرا موڈ اچھا تھا..... پتا نہیں۔ کوئی بات ضرور تھی۔

میں ہاتھ منہ دھو کے آیا تو گرم پراٹھے کی خوشبو..... آرہی تھی۔

''بس ایک پراٹھا۔'' میں نے اماں کو مزید پیڑے بناتے دیکھ کر کہا۔

''تمہارے ابا بھی آتے ہوں گے، ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ ان کے لیے بھی ساتھ ہی بنا دیتی ہوں۔ انہیں آلو کا بھرتا بہت پسند ہے۔'' اماں نے جواب دیا اور پراٹھا توے سے اتار کے مجھے دے دیا۔

میں بسم اللہ پڑھ کر کھانے لگا اور پھر سوچنے لگا پھر میں نے دیکھا کہ اماں کی جگہ کھڑکی والی پراٹھے بنا رہی ہے اور ابا کی جگہ سائیکل کی گھنٹی بجاتے ہوئے میں اندر داخل ہو رہا ہوں۔

''بھئی تمہارے پراٹھوں نے تو گلی تک مہکائی ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''لو، اب گھر میں گھستے ہی باتیں بنانے لگے۔ چلو جلدی سے آجاؤ۔'' کھڑکی والی نے مجھے دیکھا۔ اس کے بالوں کی لٹ اس کے رخسار پر ناچ رہی تھی۔ میں اسے محویت سے دیکھنے لگا۔

''ارے کیا ہوا..... کیوں لقمے کو گھورے جا رہا ہے بیٹا؟'' کسی نے میرے کندھے کو تھپتھپایا۔ میں چونک گیا۔ سارا منظر تحلیل ہو گیا۔ ابا میرے پاس کھڑے تھے۔ میں پراٹھے کا لقمہ ہاتھ میں لیے ہوئے تھا اور اماں مجھے گھور رہی تھیں۔

''ارے کیا باؤلا ہو گیا ہے؟ کیا سوچے جا رہا ہے؟ کیا پراٹھا اچھا نہیں لگ رہا؟'' اماں نے پوچھا۔

ابا ہنسنے لگے۔

اماں نے پیار سے کہا۔ ''تو پگلا گیا ہے۔ کھانے پر دھیان دیا کر۔ کیسا سوکھا ہوا جا رہا ہے؟'' اماں کے لہجے میں بڑی ممتا تھی۔ اتنی دیر میں ابا بھی ہاتھ منہ دھو کے وہیں پیڑھی پر آبیٹھے۔

''ہاں تو کیا چل رہا ہے۔'' انہوں نے مجھے مخاطب کیا۔

''جج..... جی کچھ نہیں۔'' میں نے گھبرا کے کہا جیسے میری چوری پکڑی گئی ہو۔

ابا پھر ہنسنے لگے۔ ''تو گھبرا کیوں رہا ہے۔ ناشتا کر۔''

''میرا یہ بچہ بہت سیدھا، بہت معصوم سا ہے۔'' اماں نے کہا۔ ''میں تو کہتی ہوں کہ اس کو اپنے ساتھ لگا لو۔ ابھی سے کاروبار سیکھ لے گا تو کل کو تمہارا ہاتھ بٹانے کے لیے کھڑا ہو گا۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' ابا نے کہا۔

''اپنی اولاد تو اپنی ہی ہوتی ہے۔ دوسرے کو جتنا بھی سکھاؤ، چند ہی مہینوں میں اپنی آڑھت لے کر کھڑا ہو جاتا ہے..... مگر پہلے یہ میٹرک تو کر لے۔''

میں نے فوراً موقع غنیمت جانا۔ ''ابا! ابھی تو میں آٹھویں کا امتحان دینے والا ہوں پھر اسکول کی گرمیوں کی چھٹیاں ہوں گی تو میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' ابا نے کہا۔

میں خوش ہو گیا۔ مجھے تعلیم سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور ویسے بھی میں سوچتا تھا کہ پڑھ لکھ کے بھی تو کام ہی

UUNOVELS.COM

کرنا ہے تو پہلے سے کیوں نہیں۔

☆☆☆

پتا نہیں کیا ہوا۔ شاید دل کو دل سے راہ ہوتی ہے یا وہ جیسے کہتے ہیں کہ جہاں چاہ وہاں راہ۔ میں اسکول سے گھر آیا تو اماں سے ایک عورت باتیں کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ دونوں کی پشت دروازے کی طرف تھی۔

میں اندر داخل ہوا اور حسبِ معمول سلام کیا۔ تب اس عورت اور اس لڑکی دونوں نے بیک وقت مڑ کر میری طرف دیکھا۔

میں اپنی جگہ ٹھٹک کے رہ گیا۔ ہماری نگاہیں ملیں۔ وہ کھڑکی والی تھی۔

چھریرے بدن کی۔ لمبی گردن اور لمبی چوٹی والی۔

ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ہماری آنکھوں میں حیرت اور پہچان لیے جانے کی مسرت تھی۔

ہم دونوں کے درمیان نگاہوں کا برقی سرکٹ مکمل ہو گیا تھا۔ ایک انہونی شناخت کا مرحلہ مکمل ہو گیا تھا۔

وہ عورت اب اماں سے باتیں کر رہی تھی۔ میں ابھی تک وہیں اور ویسے ہی کھڑا تھا اور وہ ابھی تک رخ موڑے میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

اماں نے مجھے دیکھا اور بولیں۔ ''وہاں کیوں کھڑے ہو۔ ذرا باجی حمیرا کے گھر یہ سامان پہنچا دو۔''

''جی، اچھا.....'' میں نے کہا۔

وہ عورت اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ طویل قامت دبلی پتلی تیکھے نین نقوش والی عورت تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ لڑکی بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے رہنے دو باجی۔ میں اٹھا لوں گی۔'' اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''کوئی بات نہیں، گھر دور ہی کتنا ہے۔ یہ پہنچا دے گا۔'' اماں نے میری طرف اشارہ کیا۔

میں کتابیں ایک طرف رکھ کر آگے بڑھا اور سامان سے بھری ٹوکری اٹھا لی جس میں اماں نے بہت ساری سبزیاں بھر دی تھیں۔ وہ اماں کو خدا حافظ کہہ کر بیرونی دروازے کی طرف چل دیں۔

وہ لڑکی میرے نزدیک سے گزری تو میں نے محسوس کیا کہ اس کا قد اپنی ماں کی طرح لمبا ہے اور مجھ سے بھی چند انچ نکلا ہوا تھا۔

مجھے تھوڑی سی شرمندگی ہوئی۔ اب بھلا مرد عورت سے قد میں چھوٹا ہو تو جوڑ کیا اچھا لگے گا۔ مجھے آپ ہی اپنے خیال پر شرمندگی کے باوجود ہنسی آ گئی۔ میری ہنسی کی آواز پر اس لڑکی نے چونک کر مجھے دیکھا اور مسکرا دی۔

میں ان کے پیچھے پیچھے ٹوکری اٹھائے چلنے لگا۔ جب میں نذیر کی بیٹھک کے سامنے سے گزرا تو نذیر اپنی بیٹھک کے دروازے میں ہی کھڑا تھا۔ مجھے ان دونوں کے ساتھ دیکھ کر اس کی آنکھیں اتنی پھیل گئیں کہ جیسے ابھی حلقوں سے گوٹیوں کی طرح اچھل کر باہر آ جائیں گی۔ جب میں اس کے قریب سے گزرا تو ایک فاتحانہ مسکراہٹ میرے ہونٹوں پر تھی۔

اسی وقت اس کی ماں بڑبڑائی۔ ''اے منحوس یہاں کھڑا ہے۔ جب بھی کھڑکی کھولو، یہ منہ اٹھائے اوپر ہی دیکھتا رہتا ہے۔ دیدے پھاڑے منحوس اندھا نہ ہو جائے۔''

مارے گھبراہٹ کے میری مسکراہٹ کافور ہو گئی۔ کیا اس کی اماں نے مجھے بھی بیٹھک میں دیکھا ہے؟ میں ہڑبڑا گیا۔

ماں کی بڑبڑاہٹ سن کر لڑکی نے میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں فہمائش تھی۔

''اگر تمہیں بھی میری اماں نے اس منحوس کے ساتھ دیکھ لیا تو.....؟''

اتنی دیر میں ان کا گھر آ گیا۔ وہ دروازہ کھول کے اندر داخل ہو گئیں۔

''یہاں رکھ دو بیٹا۔'' اس عورت نے کہا۔

''جی.....'' میں نے سعادت مندی سے کہا۔

''بیٹھو، شربت پی کے جانا۔'' اس نے کہا اور اندر چلی گئی۔

ہم دونوں کھڑے رہ گئے اور ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر میں نے ہمت کر کے کہا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' اس نے عین اسی وقت پوچھا۔

نہ جانے کیا ہوا کہ ہم دونوں ہی ہنس پڑے۔ دبی دبی ہنسی تھی۔

''میرا نام زبیدہ ہے۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''میرا نام ماجد ہے۔'' میں نے دھیرے سے کہا۔

پھر ہم دونوں خاموش ہو گئے۔

اس کی ماں اندر سے ایک گلاس میں سرخ رنگ کا شربت لے آئی۔ خوشبو سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ روح افزا تھا۔

میں نے کہا۔ ''رہنے دیتیں خالہ..... کونسا میں اتنی دور سے آیا ہوں۔''

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''گرمی ہے پی لو۔''

پھر وہ زبیدہ سے مخاطب ہوئیں۔ ''ذرا یہ سبزی اٹھا

کے باورچی خانے میں رکھ دو۔"

زبیدہ نے جھک کے سبزی کی ٹوکری اٹھائی اور باورچی خانے کی طرف چل دی۔ میرے ہونٹ گلاس کے کناروں پر تھے اور آنکھیں زبیدہ کے تعاقب میں۔

واپسی پر میں جیسے ہی نذیر کی بیٹھک کے پاس سے گزرا، اس کی آواز آئی۔ "اوئے اندر آجا۔"

میں نے پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ کھڑکی بند تھی۔ میں غڑاپ سے بیٹھک میں گھس گیا۔

"ابے کمال کر دیا تو نے..... کیسے ہوا یہ؟" نذیر کے انداز میں زبردست جوش تھا۔

"بس کر لیا۔" میں نے بے وجہ ہی فاتحانہ انداز میں سینہ پھلایا۔

"واقعی تو تو میسنا ہے یار۔" نذیر نے مجھے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔

"کیسے ہوا یہ سب کچھ..... کیا نام ہے اس کا؟ کون ہیں یہ لوگ؟ کہاں سے آئے ہیں؟" نذیر نے کئی سوالات پے در پے داغ دیے۔

"ابھی کچھ پتا نہیں۔" میں نے کہا۔

"سچ کہہ رہا ہے؟" نذیر نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "اتنی ساری سبزیاں تم نے بغیر کسی جان پہچان کے پہنچا دیں؟"

"وہ تو اماں نے کہا تھا..... سچی۔" میں نے فوراً ہی کہا۔

"چل کچھ نہیں تو نام تو تو نے پوچھا ہی ہوگا؟" نذیر نے بدستور تفتیش جاری رکھی۔

"نام تو..... اس..... کا..... زبیدہ..... ہے۔" میں نے رک رک کے کہا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے نذیر کا اس طرح اس کے متعلق اتنا زیادہ پوچھنا اچھا نہیں لگا۔ شاید یہ بھی محبت کا کوئی چلن ہوتا ہو کہ جو آپ کو اچھا لگے، کوئی دوسرا اس کو سراہے تو برا لگتا ہے۔

نذیر نے مجھے چپ..... دیکھ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے، بڑا چپ چپ ہے۔ کوئی بات ہے کیا؟"

"نہیں....." میں نے جلدی سے کہا۔ "اماں نے کہا تھا کہ جلدی آنا، دال منگوانی ہے۔"

نہ جانے کیوں میں نے جھوٹ بول دیا۔

"اچھا جا۔ آئندہ جو بھی کچھ ہو بتاتے رہنا۔" نذیر نے کہا۔

پتا نہیں کیوں، میں نے بیٹھک کے دروازے سے نکلنے سے پہلے باہر کا جائزہ لیا۔ کھڑکی بند تھی۔ میں جھپاک سے دو قدم بڑھا کے گلی کے بیچ میں آ گیا جیسے میں نذیر کی بیٹھک میں گیا ہی نہیں تھا۔

"منحوس نذیرا..... دیدے پھاڑ نذیرا۔"

میں نے سوچا اور پھر خود ہی ہنس پڑا۔

☆☆☆

پھر ان ہی دنوں میرے آٹھویں کے امتحانات شروع ہو گئے۔ اماں کی سخت وارننگ تھی کہ خبردار جو اب فیل ہوا۔ چھوٹے بہن بھائی تیرے ساتھ کے ہو گئے ہیں مگر تجھے ذرا بھی شرم نہیں۔ اس لیے مجھے ہر حالت میں آٹھویں پاس کرنا تھی اور ویسے بھی اگر میرے فیل ہونے کی اطلاع زبیدہ اور اس کی ماں کو ملتی تو کتنا برا ہوتا۔

ان دنوں مائیں اپنے بچوں کے نتیجے بتانے سے پہلے جانتی تھیں کیونکہ سرکاری اسکول میں محلے کے سارے ہی بچے جاتے تھے اور کلاس میں ملنے والی تمام سزاؤں کی کارروائی روزانہ براڈ کاسٹ ہوتی تھی۔

اس دوران میں صرف دو مرتبہ سبزی دینے ان کے گھر گیا تھا اور دونوں ہی مرتبہ زبیدہ کے بجائے اس کی ماں نے سبزی وصول کی تھی اور بنا شربت پلائے دروازے سے ہی رخصت کر دیا تھا۔

حالانکہ ہم لوگ محلے میں کسی کو سبزی نہیں بیچتے تھے۔ آڑھت میں جو سبزی آتی تھی، وہ ابا لے آتے تھے اور اتنی ہوتی تھی کہ اماں محلے کے اکثر گھروں میں تقسیم کر دیا کرتی تھیں۔ بقول اماں کے تقسیم کر کے کھانے سے رزق میں برکت ہوتی ہے اور یہ بات..... سچ تھی اماں کی۔

☆☆☆

خدا خدا کر کے آٹھویں کے امتحان ختم ہوئے اور میری جان چھوٹی۔ میں نے دل میں پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اب مجھے نہیں پڑھنا۔ اس لیے امتحان کے چند دنوں بعد ہی میں نے ابا سے کہا۔

"ابا! میں بھی کل سے آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

"ارے چھوڑو..... کہاں رات تین بجے خوار ہوتا پھرے گا۔" ان کے انداز میں بڑی محبت تھی۔

"تو کیا ہوا؟" میں نے کہا۔ "آپ بھی تو جاتے ہیں۔"

"میں....." ابا نے ہنس کر کہا۔ "مجھے تو لے جاتے ہیں۔"

"کون؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ذمے داریوں، ضرورتوں کے بھوت۔ خوشحالی کی طلب کے بھوت۔" وہ ہنسنے لگے۔

اماں نے کہا۔ "اب یہ کیا اول فول بولنا شروع کر

دیا۔ اللہ کا شکر ادا کرو، تین بجے جا کے سات آٹھ بجے واپس آجاتے ہو۔ اچھا بھلا کماتے ہو۔ پیسا بھی، ثواب بھی۔''

''اب پیسا تو ٹھیک ہے، یہ ثواب کا فلسفہ کہاں سے نکال لیا تم نے؟'' ابا ہنسے۔

''یہ جو سبزیاں آتی ہیں، بکتی ہیں، کتنے ہی لوگ کھانے کے بعد خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ ان میں سے کتنے ہی لوگ تم لوگوں سے ٹھیلے، پتھاروں پر بیچنے کے لیے لے جاتے ہوں گے۔ کتنوں کی روزی روٹی کے سبب بنتے ہو۔ ان ہی کے طفیل اللہ پاک دے رہا ہے۔'' اماں ہر بات میں شکر کا، ثواب کا پہلو نکال لیتی تھیں۔

''کمال ہے، تم تو بہت اچھی باتیں کرتی ہو نصیرہ۔'' ابا جب بہت خوش ہوتے یا بہت محبت جتاتے تو اماں کا نام لے کر مخاطب کرتے۔

''اور کیا..... اپنے کام کو عبادت سمجھنا چاہیے جو کام ہو۔ رزق کمانے کا ذریعہ تو ہے۔ اللہ نے ہزاروں سے اچھا رکھا ہے۔ گھر بار، اولاد اور پیسا سب ہی تو ہے۔ بس اب تو بچوں کی شادیوں کی تیاری کرو۔''

''ارے کیا ہوا ماجد کی ماں..... یہ سب تو ابھی چھوٹے ہیں۔''

''ہاں مگر لڑکیاں تو گھڑیاں ہوتی ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بڑی ہو جاتی ہیں۔'' اماں نے کہا۔ ابا چپ ہو گئے۔

میں نے ابا سے کہا۔ ''میں سونے جا رہا ہوں۔ مجھے لازمی اٹھا دیجیے گا۔''

''اچھا..... اچھا.....'' ابا نے کہا۔

میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا اور بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا۔ کیا سوچ رہا تھا، کچھ واضح نہیں تھا لیکن کہیں دور پس منظر میں زبیدہ ضرور تھی۔

☆☆☆

رات ڈھائی بجے اماں نے مجھے اٹھایا اور میں فوراً ہی اٹھ بیٹھا۔ اماں کو بڑی حیرت ہوئی لیکن وہ کچھ بولیں نہیں۔ شاید وہ اسے میرا چند دنوں کا شوق سمجھ رہی تھیں۔

میرے ساتھ جانے کی وجہ سے ابا نے سائیکل کے بجائے موٹر سائیکل نکال لی۔ چلانا تو مجھے بھی آتی تھی لیکن ابا چلانے کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ ابھی چھوٹے ہو۔

ناشتا کر کے چائے پی کے ہم لوگ منڈی کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا کی خنکی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ہم لوگ تھوڑی ہی دیر میں منڈی پہنچ گئے جہاں دیہی علاقوں سے آلو، پیاز، ٹماٹر اور دیگر سبزیوں کے ٹرک اور ڈالے آکے کھڑے ہو رہے تھے۔

تھوڑی دیر میں آڑھت شروع ہو گئی۔ ابا کی سب ہی سے جان پہچان تھی۔ آڑھت منڈی میں ہماری ایک چھوٹی سی دکان بھی تھی۔

''ٹماٹر بڑھیا ہیں۔'' ایک بیوپاری نے ابا سے کہا۔ میں نے دیکھا کہ واقعی ٹماٹر سرخ اور خوب پکے ہوئے تھے۔ ابا نے نظر انداز کر دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ ٹماٹر کیوں نہیں لیے؟''

ابا نے کہا۔ ''ٹماٹر بالکل تیار ہیں۔ دو دن بھی ٹھہر نہیں پائیں گے اور گلنا شروع ہو جائیں گے اس لیے ٹماٹر ہمیشہ وہ لو جو تھوڑے سے کچے ہوں تاکہ گلے سڑے نہ نکلیں۔'' ابا نے سمجھایا۔

واقعی اس پہلو پر تو میں نے سوچا ہی نہ تھا۔

مختلف لوگ آتے رہے۔ ابا مال لیتے رہے اور ہاتھ کے ہاتھ بیچتے رہے۔ کچھ مال انہوں نے کریم کے ساتھ لگوا دیا جو منڈی میں ہی ایک زمین پر بڑی سی چٹائی لیے بیٹھا تھا جس پر مختلف سبزیاں رکھی ہوئی تھیں۔

''آج تو تم بھی آئے ہو..... کیا اسکول کی چھٹیاں ہو گئیں؟'' کریم نے پانچ کلو کا تھیلا بناتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں امتحان ختم ہو گئے ہیں، میں نے سوچا کہ ابا کے ساتھ چلا آؤں۔ منڈی دیکھوں۔''

''اچھا کیا..... چائے پیو گے؟'' کریم نے پوچھا اور ساتھ ہی چائے والے کو اشارہ کر دیا۔ ذرا سی دیر میں چائے اور باقر خانی آگئی۔

ابا بدستور کبھی ایک ٹرک تو کبھی دوسرے ڈالے کا سودا کرتے پھر رہے تھے۔ بعض ٹرک تو انہوں نے لیتے ہی بیچ دیے۔ انہیں ادھر ادھر کرنے کی نوبت بھی نہیں آئی۔

''یہ کام تو بڑے مزے کا ہے۔'' میں نے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''مزے کا تو ہے، بس دھیان رکھنا پڑتا ہے کہ کس سبزی کی کھپت زیادہ ہے، کس کی کم۔'' کریم نے بتایا۔

''مگر آلو، پیاز، ٹماٹر تو ہمیشہ ہی بکتے ہیں۔'' میں نے فوراً کہا۔

''ہاں مگر آلو کی کھپت ہر اسکول کی چھٹیوں میں کم ہو جاتی ہے۔ فرق پڑ جاتا ہے۔'' کریم نے کہا۔ ''چپس کا چالو کام کم ہو جاتا ہے۔''

''اچھا اچھا۔'' میں نے سر ہلایا۔ جیسے مجھے پہلے ہی سے معلوم ہو۔

JUNOVELS.COM

اس صبح گھر واپسی پر ابا نے مجھے پچاس روپے دیے۔
''اتنے سارے پیسے۔'' میں نے حیرت سے پیسے پکڑتے ہوئے پوچھا۔
''آج پہلا دن تھا تمہارا منڈی میں اور آج بکری بہت اچھی ہوئی ہے۔'' ابا کے چہرے پر بھرپور مسکراہٹ تھی۔ ''مجھے اچھا لگا کہ تم نے میرے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ تمہیں کیسا لگا؟''
''بہت اچھا۔'' میں نے جواب دیا۔
''اچھا منہ ہاتھ دھولو۔ میں ناشتا لا رہی ہوں۔'' اماں نے کہا۔
میں منہ ہاتھ دھو کے آ کر بیٹھا ہی تھا کہ میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور تھوڑی ہی دیر میں، میں بے خبر سو گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو دن کے دو بج رہے تھے۔
اماں نے مجھے اٹھتے دیکھ کر کہا۔ ''بھوک لگی ہوگی۔ کھانا کھالو۔''
مجھے سچ مچ بہت زور کی بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کلی کی اور آ کے اماں کے پاس پیڑھی پر بیٹھ گیا۔ ابا نظر نہیں آ رہے تھے۔ اماں نے بتایا کہ وہ کسی کام سے گئے ہوئے ہیں، شام تک آئیں گے۔
''تم کھانا کھالو پھر ذرا سبزی تو دے آنا۔'' اماں نے کہا۔
''کس کو دینی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔
''اپنے دوست کو دے دینا۔'' اماں نے کہا۔ ''نذیر کو.....''
''اچھا..... بس..... اور کسی کو نہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''کیوں، تمہیں کسی خاص کو دینا ہے کیا؟'' اماں نے پوچھا۔
''نہیں بھلا میں کس کو دوں گا۔ جس کو آپ کہیں گی اسی کو دینا ہوگی۔'' میں نے کہا۔
''اچھا یاد دلایا، کچھ سبزی حمیرا خالہ کے گھر دے آنا۔'' اماں نے کہا۔
''خالہ حمیرا کون؟'' میں نے پوچھا۔
''ارے وہی جو اس دن اپنی لڑکی کے ساتھ آئی تھی۔'' اماں نے کہا۔
''تو کیا وہاں بھی جانا پڑے گا؟'' میں نے بظاہر اوپری دل سے کہا۔
اماں بولیں۔ ''محلے والوں کا خیال رکھتے ہیں۔ یہ مکان برسوں پہلے حمیرا کے باپ نے خریدا تھا۔ پھر وہ لوگ دوسرے شہر چلے گئے۔ اب بھائیوں میں جھگڑا ہو گیا ہے تو حمیرا اپنے باپ کے مکان میں آ گئی ہے۔ برسوں تو خالی پڑا رہا۔''
''اچھا.....'' مجھے حیرت ہوئی کہ اماں کو ان کے متعلق اتنا کچھ پتا تھا جبکہ میرا خیال تھا کہ وہ لوگ اس محلے میں نئے نئے آئے ہیں۔ حمیرا کے متعلق یہ بات ٹھیک تھی کیونکہ وہ واقعی اس محلے میں نئی تھیں لیکن ان کے والد کو محلے کے پرانے لوگ جانتے تھے۔
میں نے کھانا ختم کر کے ٹوکری سنبھالی جس میں اوپری تھیلا نذیر کے لیے تھا۔ میں نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے اس کی ماں نے جھانکا۔ میں نے انہیں سبزی کا تھیلا دیا اور آگے چل دیا۔
میری نظر اوپر اٹھی تو زبیدہ کا چہرہ کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، اس وقت ساری گلی ہی خالی تھی۔ میں اس کے دروازے پر پہنچ گیا۔
میں نے جونہی دروازہ کھٹکھٹایا، زبیدہ نے جھٹ سے دروازہ کھول دیا۔
''یہ میری اماں نے سبزی بھیجی ہے۔'' میں نے کہا۔
''اچھا جی.....'' زبیدہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں چمک۔ وہی چمک جو من پسند ہم جولیوں کے درمیان ہوتی ہے یا پھر شاید کچھ زیادہ۔
''تم خود نہیں لائے؟'' اس نے پوچھا۔
''کیا مطلب..... تو پھر کون لایا ہے؟'' میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔
''وہ..... میرا مطلب تھا کہ تم خود سے لائے ہوگے۔ اپنی مرضی سے۔'' اس نے سادگی سے کہا۔
میں چپ رہا پھر بولا۔ ''یوں سمجھ لو کہ میں ہی لایا ہوں مگر اماں کی اجازت ضروری تھی۔''
''اچھا جی.....'' اس نے شوخی سے اپنی بڑی بڑی آنکھیں پوری کھولیں۔ ''اور کس کس بات میں اماں کی اجازت ضروری ہے؟''
''پتا نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ایک بات کہوں؟'' میں نے کہا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔
''کہو۔''
''وہ تم کھڑکی میں نہ کھڑی ہوا کرو۔'' میں نے دل کڑا کر کے کہہ دیا۔
''کیوں جی..... تمہیں کیا اعتراض اور کیوں اعتراض؟'' اس نے جرح کی۔
''دیکھو، اچھا نہیں لگتا کہ گلی کے سب لوگ تمہیں دیکھیں۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔
''اچھا.....'' وہ جیسے سوچ میں پڑ گئی۔

UUNOVELS.COM

''مانو گی نا میری بات.....زوبی.....'' میں نے بڑی آس لگا کے کہا۔

''زوبی.....'' وہ ہنسنے لگی۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا، وہ چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا کے اندر بھاگ گئی۔ میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ سبزی بیچ دروازے میں پڑی رہ گئی۔

میں نے چند منٹ انتظار کیا اور سوچا شاید اسے میری بات بری لگ گئی..... مگر کون سی؟ کھڑکی میں کھڑا ہونے کی یا پھر زوبی کہنا؟

میں چند لمحے خاموش کھڑا رہا۔ پھر میں نے سبزی کی ٹوکری اندر سرکائی اور دروازے کے دونوں پٹ بند کر کے واپس آ گیا۔

آتے ہوئے میرے قدم کہیں زیادہ بوجھل اور تھکے ہوئے تھے۔

☆☆☆

رات مجھے بڑی مشکل سے نیند آئی۔

حامد نے مجھے کروٹیں بدلتا دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا ہوا، کیا چارپائی میں کھٹمل ہو گئے ہیں؟''

''نہیں تو۔'' میں نے خوامخواہ ہی سر کھجایا اور اٹھ کے بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے، کوئی پریشانی ہے کیا۔ اگر صبح ابا کے ساتھ نہیں جانا تو منع کر دو۔ پریشان کیوں ہو رہے ہو؟'' حامد نے کہا۔

''نہیں، یہ بات نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''شاید میں واپس آ کے دوپہر تک سوتا رہا اس لیے نیند نہیں آ رہی ہے۔''

''ہاں.....'' حامد نے کہا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔

میرے ذہن میں زبیدہ تھی۔ پتا نہیں کیوں میں نے اس کو زوبی کہہ دیا۔ ''کیا جو لوگ اچھے لگتے ہیں ان کو مختلف ناموں سے پکارنا اچھا لگتا ہے؟'' میں نے خود سے پوچھا۔

میں نے دوبارہ زیر لب کہا۔ ''زوبی.....زوبی.....''

میں پتا نہیں کب زوبی کہتے کہتے سو گیا۔ رات تقریباً ڈھائی بجے اماں نے مجھے جگا دیا۔ ناشتا تیار تھا۔ ہم لوگ ناشتا کر کے نکل کھڑے ہوئے۔ حسب معمول ابا نے موٹر سائیکل لے لی۔ موٹر سائیکل پر سبزی لانا بھی آسان ہوتا تھا۔

میں نے ابا سے پوچھا۔ ''آپ روز موٹر سائیکل پر کیوں نہیں جاتے تھے؟''

''یار! ایک تو پٹرول خرچ ہوتا ہے، دوسرے سائیکل چلانے سے ذرا ٹانگیں کھل جاتی ہیں۔ گوڈے گٹے سب ہل جل کے سیٹ رہتے ہیں۔'' ابا نے ہنس کر کہا۔

منڈی میں وہی سماں تھا۔ البتہ کریم مجھے آج بھی دیکھ کر حیران ہوا اور خوش بھی کہ میں نے واقعی کام میں دلچسپی لینا شروع کر دی ہے۔

مال خریدنے بیچنے کے چکر میں صبح ہو گئی۔ اس دوران میں دو مرتبہ میں نے چائے، بسکٹ سے خوب انصاف کیا۔ تیز لائٹوں میں منڈی میں دن کا سا سماں تھا۔

واپسی پر ابا نے کہا۔ ''مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے کہ تم کام کو سمجھ رہے ہو۔ یاد رکھو، کم منافع اور تیزی سے فروخت کاروبار کی ترقی کا سب سے آسان نسخہ ہے۔ پیسا زیادہ دیر کے لیے نہ روکو۔ اسے حرکت دیتے رہو۔ یہ چلتے چلتے انڈے بچے دیتا رہے گا۔ رک گیا تو خود کو کھانا شروع کر دے گا۔''

''جی.....''

''کیا سمجھے؟''

''یہی کہ مال کو جلدی خرید کر جلدی بیچو۔ زیادہ منافع کے لالچ میں روکے نہ رکھو۔ کہیں قیمت گر گئی تو نقصان ہو جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ارے یار! تو تو بڑا سمجھ دار ہے۔'' ابا نے تعریفی انداز میں کہا۔

''پتا نہیں.....'' مجھے شرم سی آ گئی اپنی تعریف پر مگر میں اندر ہی اندر بہت خوش ہوا۔

ہم نے گھر آ کے ہلکا پھلکا ناشتا کیا پھر میں لیٹ کے سو گیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو دوپہر کے ڈھائی بج رہے تھے۔

اماں نے کہا۔ ''تمہارے ماسٹر کلیم اللہ آئے تھے۔ پوچھ رہے تھے، ابھی تو چھٹیوں میں کچھ دن باقی ہیں۔ تم نے اسکول آنا کیوں چھوڑ دیا۔ اب تو نویں شروع ہونے والی ہے۔''

''اماں! میں اب نہیں پڑھوں گا۔'' میں نے صاف صاف کہا۔

''ارے میٹرک تو کر لے۔'' اماں نے پچکارا۔ ''بھلا آٹھویں پاس کو کون پوچھے گا؟''

''جیسے آپ نے ابا کو پوچھ لیا۔'' بے ساختہ میرے منہ سے جانے کیوں اور کیسے نکل گیا۔

اماں چند لمحے مجھے گھورتی رہیں پھر ہنس پڑیں۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ میں بس ابا کے ساتھ کام میں لگوں گا۔'' میں نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔

''تجھے کمانے کی اتنی جلدی کیوں پڑ گئی؟'' اماں نے پوچھا۔

UUNOVELS.COM

''سترہ برس کا ہو گیا ہوں میں.....'' میں نے کہا۔
''تو کیا ہوا؟'' اماں نے بے پروائی سے کہا۔ ''تم ستر برس کے بھی ہو کے میرے لیے بچے ہی رہو گے۔''
''آپ جو چاہے کہیں مگر اب مجھے نہیں پڑھنا، بس۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔
''چلو پھر دیکھیں گے۔'' اماں نے اپنایت سے کہا اور میرے آگے ناشتے کی ٹرے رکھ دی۔

☆☆☆

میں پوری تندہی سے ابا کے ساتھ کام میں لگ گیا۔ اماں میرے اس طرح ذمے داری سے اٹھنے پر حیران بھی تھیں اور خوش بھی۔ چلو کسی کام میں تو میرا دل لگا مگر میرے اندر شاید ایک لاشعوری خواہش تھی۔ جلد از جلد اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کیونکہ میں جب تک اپنے پیروں پر نہ کھڑا ہوتا... میری من کی مراد پوری نہیں ہو سکتی تھی۔
مگر پھر جو باتیں خیالوں خوابوں اور تنہائیوں میں ہوتی تھیں..... جن کے وجود کے دم سے میرے اندر توانائی تھی، وہ وجہ اچانک ہی معدوم ہو گئی۔
اس دن گوبھی کی نئی فصل آئی تھی۔ خوش رنگ کھلی کھلی گوبھی بہت عمدہ تھی۔ اماں نے کہا۔ ''دو تین جگہ جا کے دے آ۔'' مگر اس میں حمیرا خالہ کا ذکر نہیں تھا۔
میں نے اماں سے پوچھا۔ ''کیا آپ حمیرا خالہ کے گھر سبزی نہیں بھیجیں گی؟''
''کیا مطلب؟ تمہیں معلوم نہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔
''کیا.....؟'' اچانک میرا دل دھک سے رہ گیا۔
''وہ لوگ واپس چلے گئے۔ ان کے بھائیوں کی آپس میں صلح صفائی ہو گئی۔ دونوں چھوٹے بھائی آ کے بڑے بھائی کو منا کے لے گئے۔ وہ تو جاتے ہوئے ملنے بھی آئی تھی مگر تم گھر پر تھے ہی نہیں۔ یہ حمیرا تمہارے لیے ایک ڈبا دے گئی ہے۔ کہہ رہی تھی ماجد بہت اچھا لڑکا ہے۔ اس میں اس کے لیے کچھ چیزیں ہیں۔ میں نے لے کر تمہارے کمرے کی الماری کے اوپری خانے میں رکھ دیا ہے۔''
''وہ..... وہ کب گئے؟'' میری آواز جیسے مردہ ہو گئی۔
''چار پانچ دن ہو گئے ہیں.....'' اماں نے کہا۔ اسی وقت چھوٹی بہن نے آواز دی، وہ باہر چلی گئیں۔
میں تیزی سے اپنے کمرے کی طرف لپکا۔ اسٹول پر چڑھ کر میں نے ڈبا اتارا۔ جوتے کے ڈبے کو رنگین پنی کے کاغذ میں پیک کیا گیا تھا۔
میں نے بے تابی سے ڈبا کھولا۔ ڈبے میں کہانیوں کی ایک کتاب ''سمسن ڈیلائیلا'' رکھی تھی جو میں نے اس کو لا کر دی تھی جب اس نے کہا تھا کہ خالی سبزی ہی لاتے رہو گے بس؟ مجھے کچھ اور نہ سوجھا تو میں نے اس کو یہ کتاب دے دی تھی اور ایک لمبی چوٹی جو میں نے دیکھتے ہی پہچان لی تھی۔ یہ وہی چوٹی تھی جو زولی اپنے بالوں میں گوندھتی تھی۔ جس کو میں بڑے غور سے دیکھتا تھا جب وہ اسے ہاتھ میں لے کر مل دیتی رہتی تھی۔
بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ محبت جو کبھی نہیں گئی، وہ محبت جو کہی نہیں گئی، وہ محبت جو ابھی بیان ہی نہیں کی گئی تھی..... اس ان کہی محبت نے اپنے ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ زبیدہ کا یہ تحفہ اس بات کو صاف صاف بیان کر رہا تھا کہ میرا جذبہ یکطرفہ نہ تھا لیکن وہ جا چکی تھی۔
میں نے ڈبا واپس اپنے کپڑوں کے نیچے چھپا دیا۔ اگر گھر میں کوئی دیکھ لیتا تو اس تحفے کا جواز کیا پیش کرتا میں؟ میں لڑکا ہو کے بزدل تھا۔ وہ لڑکی ہو کے بہادر تھی جو اپنے احساسات کا اظہار کر گئی تھی۔
میں چپ چاپ اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں اماں اندر آئیں تو مجھے لیٹا دیکھ کر قریب آ گئیں۔ میں نے جلدی سے آنکھیں موند لیں۔ اس وقت کسی سوال جواب یا کسی سے بات کرنے کو میرا دل نہیں چاہ رہا تھا۔
اماں مجھے سوتا دیکھ کر واپس پلٹ گئیں اور جاتے ہوئے کمرے کا دروازہ آہستہ سے بند کر گئیں۔ کمرے میں تاریکی سی چھا گئی۔
اکیلا ہوتے ہی نہ جانے کب اور کیسے میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ پڑا۔ اور میں نہ جانے کتنی ہی دیر تکیے پر اوندھا لیٹا روتا رہا۔ آنسو بہاتا رہا اور روتے روتے آنسو بہاتے بہاتے نہ جانے کب میں خود سے بے خبر ہو گیا۔

☆☆☆

جب مجھے ہوش آیا تو اماں میرے سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھیں اور ابا سے کہہ رہی تھیں۔
''اب نہ لے جانا میرے بچے کو۔ رات نکلتے ہو، پتا نہیں کس کی اوپری نظر لگ گئی میرے بچے کو۔''
''میں کہاں لے جاتا ہوں اس کو، اپنی ضد سے جاتا ہے۔'' ابا نے احتجاجاً کہا۔
''بس میں نے کہہ دیا، اب بالکل بھی نہیں جائے گا۔'' اماں نے غصے سے کہا۔ ابا چپ رہے۔
مجھے بہت تیز بخار تھا جو تین چار دن جاری رہا۔ اس

UUNOVELS.COM

دوران میں صرف مجھے نذیر ہی ملنے آیا۔ اماں نے اسے میرے کمرے میں بھیج دیا۔

''تم دونوں باتیں کرو، میں تمہارے لیے چائے بسکٹ لاتی ہوں۔'' وہ کہہ کر باہر چلی گئیں۔

''کیوں بخار چڑھا لیا تو نے؟'' نذیر نے پوچھا۔

''لو بھلا، بخار کوئی پوچھ کر آتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تیرے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی ہیں۔ تُو تو بڑا اداس اداس نظر آرہا ہے۔ خیر تو ہے نا؟'

''سب خیر ہے۔'' میں نے نظریں چرائیں۔

''اب تو اپنے ابا کے ساتھ کام پر جانے لگا ہے۔ خوب پیسے کمائے گا۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''پتا نہیں۔''

''کہیں تجھے کوئی غم تو نہیں لگ گیا؟'' اس نے پوچھا۔

''کیسا غم..... کس کا غم؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

وہ ہنسنے لگا۔

''اسی کا جو چلی گئی۔'' نذیر نے اطمینان سے کہا۔

''بڑا کمینہ ہے تو.....'' میں نے کہا اور ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے میری آنکھوں کے گوشے نم ہونے لگے اور میں ہنستے ہنستے رونے لگا۔

نذیر چپ چاپ مجھے دیکھنے لگا۔ باہر سے اماں کے آنے کی آہٹ سنائی دی۔ میں جلدی سے چپ ہو گیا اور انگلیوں سے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

اماں چائے بسکٹ لے آئیں اور رکھ کے چلی گئیں۔

اماں کے جانے کے بعد نذیر نے کہا۔ ''یار چھوڑو، زندگی میں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اس طرح کرے گا تو مر جائے گا۔''

میں کچھ نہ بولا۔ بھلا ہر کوئی..... چاہے وہ نذیر ہی کیوں نہ ہو، آپ کے دل کی کیفیت کیسے اور کتنی جان سکتا ہے؟

میں نے کہا۔ ''مجھے اس کا غصہ نہیں ہے۔''

''پھر.....؟'' نذیر نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''اس نے تو مجھے خوشی دی تھی۔ بس اس کے ہونے سے مجھے اچھا لگتا تھا۔''

''کیا اچھا لگتا تھا؟'' نذیر نے جرح کی۔

''پتا نہیں لیکن اس کے جانے کا سن کر میرے اندر جیسے کچھ خالی خالی سا ہو گیا ہے۔ کچھ کمی ہو گئی ہے۔ کیا کمی؟ میں نہیں جانتا۔'' میں نے سچائی سے جواب دیا۔

نذیر کچھ نہ بولا۔ بس چائے میں بسکٹ ڈبا ڈبا کے کھاتا رہا پھر اس نے سُڑک سُڑک کے چائے پی۔

''میرا خیال ہے کہ تجھے اس سے سچا پیار ہو گیا تھا۔'' نذیر نے چائے کی خالی پیالی واپس رکھی۔

''تو کیا پیار جھوٹا بھی ہوتا ہے؟''

''جب سچا ہوتا ہے تو جھوٹا بھی ہوتا ہوگا۔'' نذیر نے منطقی جواب دیا اور ہنسنے لگا۔ ''پیارے! ابھی سے اس چکر میں نہ پڑ۔ بڑی عمر پڑی ہے۔ کچھ دنوں بعد تو سب بھول جائے گا اور کسی نئے پیار میں الجھ جائے گا۔''

''بکواس.....'' میں نے تیزی سے کہا۔

مجھے اچھا نہیں لگا اس کا جملہ۔ بھلا پیار بھی کوئی بدلنے کی، تبدیل کرنے کی چیز ہے۔

''زیادہ نہ سوچا کر۔'' نذیر نے کہا۔ ''مجھے دیکھ، کبھی کسی کے چکر میں بیمار دیکھا ہے؟''

''پتا نہیں، تم کونسا مجھے اپنے چکر بتاتے ہو۔''

نذیر پھر ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسنے کی عادت مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ ہر سنجیدہ سے سنجیدہ بات کو ایسے ہی لیتا تھا۔ جب اس کا دو سال پہلے دادا فوت ہوا تھا تو وہ تب بھی ہنس رہا تھا۔

''یار! اب ابا تو مجھے خوب مارا کرے گا۔ دادا تو بچا لیا کرتا تھا، ابا کے پیسے چرانے پر۔'' وہ ہنستے ہنستے بولا پھر رونے لگا۔

''اب تیرا کیا ہوگا کالیا۔'' وہ روتے روتے پھر ہنسنے لگا۔

میں کچھ اور تو نہ بولا۔ بس اسے گلے لگا لیا مگر مجھے اس وقت نذیر کا ہنسنا برا بلکہ بہت ہی برا لگ رہا تھا۔

''اچھا میں چلتا ہوں... یار! اماں کی چائے بہت مزے کی تھی۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا پھر چند لمحے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''یار! یہ مجھے اچھا تو نہیں لگتا مگر میں کہے دیتا ہوں کہ تو بس جلدی سے ٹھیک ہو جا، پھر.....''

''تو پھر کیا؟'' میں نے بے دلی سے پوچھا۔

''پھر ہم اسے ڈھونڈنے چلیں گے۔'' نذیر نے کہا۔

''کیا.....؟'' میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ''کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

میرے دل کی دھڑکنیں کئی گنا بڑھ گئیں۔

''ہاں۔'' اس نے کہا اور پھر بغیر رکے اور بغیر کچھ مزید بولے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ یوں لگا جیسے سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا ہو۔ پتا نہیں کیوں میرے اندر ایک جوش، ایک ولولہ بھر گیا۔ مایوسی کی کیفیت امید میں بدل گئی۔

اسی وقت اماں کمرے میں داخل ہوئیں۔

UUNOVELS.COM

''لے بیٹا رات کی دوا پی لے۔'' انہوں نے دوا کی شیشی میری طرف بڑھائی۔ میں نے دوا پی لی۔

پھر میں نے پوچھا۔ ''اماں! یہاں سے حیدرآباد کتنی دور ہے؟''

''حیدرآباد۔'' اماں نے حیرت سے کہا۔ ''اب یہ اچانک حیدرآباد کی کیا سوجھی؟''

''وہ ..... وہ ..... نذیر کہہ رہا تھا وہاں کوئی شادی ہے۔ میں بھی ساتھ چلوں۔'' میں نے فوراً بہانہ تراشا۔

''دوسرا شہر ہے، بہت دور۔'' اماں نے کہا۔

''میں چلا جاؤں؟'' میں نے پوچھا۔

اماں نے جواب دینے سے پہلے کچھ سوچا پھر کہنے لگیں۔ ''اچھا بخار اتر جائے تو پھر دیکھیں گے۔''

''اماں! آپ بہت اچھی ہیں۔'' میں نے کہا۔ اظہارِ ممنونیت سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''باؤلا ہوا ہے کیا۔ سترہ برس کا ہو گیا اور بات بات پر رونے بیٹھ جاتا ہے۔'' اماں نے مجھے ڈانٹا اور ہنستی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔

☆☆☆

پتا نہیں جانے کی جلدی تھی یا اس سے ملنے کا شوق۔ میرا بخار صبح تک اتر گیا۔ میں نے سیدھے نذیر کی ڈیوڑھی کا رخ کیا۔ وہ حسبِ معمول وہاں موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔

''یہ ہوئی نا جوانوں والی بات۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

میں نے اس کی خوش دلی کو نظر انداز کرتے ہوئے سیدھا سوال داغا۔ ''حیدرآباد کب چلنا ہے؟''

''حیدرآباد؟'' اس کی آنکھوں میں حیرت کی لہر ابھری پھر وہ بولا۔ ''ہاں ..... ہاں۔ دو چار دن تو رک جا۔ میں نے ایک صاحب سے کہا ہے کہ وہ ذرا پتا نشان ڈھونڈ دیں۔ جیسے ہی وہ کچھ بتاتے ہیں، چلے چلتے ہیں پھر .....''

''وہ کب تک پتا کر لیں گے؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''کہا تو میں نے جلدی کا ہی ہے۔ کباڑ خانے آتے ہیں وہ۔ زیادہ جلدی کروں گا تو بات ابا تک پہنچ جائے گی پھر کون پوچھ گچھ کے چکر میں پڑے۔'' نذیر نے مجھے تسلی دی۔

''میں نے اماں سے کہہ دیا ہے کہ مجھے نذیر کے ساتھ شادی میں حیدرآباد جانا ہے۔'' میں نے نذیر کو بتایا۔

نذیر نے سن کے کہا۔ ''بہت اچھا کیا۔''

میں سوچنے لگا کہ اب کیا بات کروں نذیر سے۔ یہ پہلی بار ہو رہا تھا کہ نذیر سے بات کرنے کے لیے موضوع نہیں تھا میرے پاس ورنہ میری تمام دوستوں میں سب سے زیادہ گاڑھی نذیر کے ساتھ چھنتی تھی۔ ہم لوگ سارا سارا دن ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے تھے۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' نذیر نے پوچھا۔

''کچھ نہیں .....'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

میں نذیر کی بیٹھک سے باہر نکل آیا۔ میں نے زبیدہ کے گھر کی طرف دیکھا۔ دروازہ اور کھڑکی دونوں ہی کسی سہمے ہوئے مایوس شخص کے مقدر کی طرح بند تھے۔

☆☆☆

مجھ پر یہ عقدہ چند دنوں میں کھلا کہ میرے پیسے کمانے کی دھن کے پیچھے زبیدہ کے حصول کی خواہش کا طاقت ور جذبہ تھا۔

ہمارے معاشرے میں تو یہ بات عام ہے کہ جب تک لڑکا اپنے پیروں پر نہ کھڑا ہو جائے، اس کی شادی بیاہ کا سوچا بھی نہ جائے۔ شاید اسی لیے لاشعوری طور پر میں کام کی طرف راغب ہو گیا تھا مگر جب ایک بار آپ دریا میں کود پڑتے ہیں تو پھر ہاتھ پیر مارنا ہی پڑتے ہیں۔ یہی کچھ میرے ساتھ بھی ہوا۔

طبیعت بہتر ہو گئی تو ایک دن ابا نے کہا۔

''ہاں بیٹا! پھر میں رات تمہیں تین بجے تک اٹھا دوں گا؟''

''جی اچھا .....'' میں نے جواب دیا۔ ابا نے یہ نہیں کہا تھا کہ چلنا ہے یا نہیں بلکہ سیدھا حکم دیا تھا کہ چلنا ہے۔

اماں فوراً بولیں۔ ''کیوں پریشان ہوتے ہو۔ اٹھ جائے گا۔ ویسے بھی یہ بہت سمجھ دار ہے۔ دیکھنا یہ بہت ترقی کرے گا۔''

میں دوبارہ ابا کے ساتھ آڑھت پر منڈی جانے لگا۔ کئی دن گزر گئے۔

میں گاہے بگاہے پوچھتا رہتا تھا نذیر سے کہ حیدرآباد کب چلنا ہے مگر وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کے ٹال دیتا تھا۔

ایک دن میں نے زچ ہو کر کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ تو مجھے بہلا رہا ہے۔''

''دنیا ہی بہلانے اور ٹہلانے پر قائم ہے۔'' نذیر نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے متعجب ہو کے پوچھا۔ ''تو مجھے بہلا رہا تھا؟''

''تو اور کیا؟'' نذیر نے اطمینان سے کہا۔ ''جس سے یار کا دل بہل جائے، چہرے پر رونق آ جائے، اس سے

UUNOVELS.COM

اچھی کوئی خبر نہیں اور اس میں جھوٹ میرا نہیں...... تیری عقل کا کھوٹ ہے۔"

"میری عقل کا کھوٹ؟" میں نے حیرت اور تاسف سے کہا۔ "مجھے ہی بے وقوف بنا کے مجھے ہی نام دھر رہا ہے۔"

"سامنے کی بات تھی۔" نذیر نے میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "وہ مجھے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ بقول اس کی اماں کے منحوس دیدے گاڑے ہر وقت کھڑکی کو تاڑتا رہتا ہے۔ ایسے میں وہ مجھے اپنا پتا بتا کے جاتے؟ میں نے تو تجھے بہلانے کے لیے جھوٹ بولا تھا۔" میں نے قریب پڑا گلاس اس کو کھینچ مارا۔ نذیر نے بڑی مہارت سے گلاس کو کیچ کر کے سائڈ پر رکھا اور پھر ہنسنے لگا۔ مجھے بہت غصہ آرہا تھا مگر پھر پتا نہیں کیا ہوا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہنسنے لگا۔ اتنا ہنسا کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

☆☆☆

چاند سورج ایک دوسرے کے پیچھے دن رات بھاگتے رہے۔ صبح، شام میں چھپتی رہی اور شام، رات کے پہلو میں دبکتی رہی۔ میری زندگی کے ماہ و سال بیتتے چلے گئے مگر ان بیتے ہوئے ماہ و سال راتوں کو بھی کبھی وہ ڈبا کھولنے پر مجبور کردیتے جس میں کہانیوں کی کتاب۔ سیمسن ڈیلائیلا رکھی تھی اور زبیدہ کا پراندہ رکھا تھا۔ وہی چوٹی جو وہ اپنے لمبے لمبے بالوں میں گوندھتی تھی۔ اس میں سے آج تک اس کے بالوں کی خوشبو آتی تھی۔

گزرتے سالوں میں بڑے بھائی حامد کی شادی ہو گئی۔ ابا نے اسے اپنا کاروبار کروا دیا۔ وہ پھلوں کی آڑھت کرنے لگا۔ خواب تو اس کا ڈپٹی کلکٹر بننے کا تھا مگر دو مرتبہ مقابلے کے امتحان میں فیل ہو جانے کے بعد اس نے اس خواب کو لات ماری اور اس حقیقی دنیا میں آگیا جہاں پیسا تھا اور بچے تھے مگر پھر بھی ایک کسک تو ناکامی کی باقی رہتی ہے۔ جتنا وہ پڑھتا تھا ہمارا تو کیا پورے خاندان کا ہی خیال تھا کہ اس کی صاحبی میں بس ایک آنچ کی کسر ہے مگر انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ اور ہے۔

مجھ سے چھوٹی بہن رانی کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ اب اماں اور ابا میرے پیچھے پڑے تھے کہ میں شادی کرلوں مگر نہ جانے کیوں جب بھی اماں کسی لڑکی کا تذکرہ کرتیں تو میرے سامنے زبیدہ آجاتی اور میں انکار کردیتا۔

ابا نے کہا۔ "خالی لڑکیوں کے نام نہ گنواؤ۔ کسی کی تصویر دکھاؤ، تاکہ اس کو سمجھ آئے۔"

پھر اماں نے لڑکیوں کی تصویریں دکھانا شروع کر دیں مگر مجھے ہر تصویر کے پیچھے زبیدہ کا چہرہ جھانکتا دکھائی دیتا۔ تصویر دھندلی ہو جاتی۔ زبیدہ حاوی ہو جاتی۔

ایک دن اماں نے زچ ہو کر کہا۔ "بات سن ماجد...... اب میں تجھے نہ نام بتاؤں گی، نہ تصویر دکھاؤں گی۔ بس سیدھا سیدھا تیری رخصتی کرالاؤں گی۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"لو جی دیکھو۔ ستائیس برس کا ہو گیا اور گھر داری کا ہوش نہیں۔" اماں کو غصہ آگیا۔

"یہ میں ہوں...... تیری ماں۔ جو تیرا گھر بسانے کے لیے بے چین ہے۔ ورنہ میرے بعد بہن بھائی ان چکروں میں نہیں پڑتے کہ بھائی کی شادی کے لیے اُتاولے پھریں۔"

"مگر آپ کہاں جا رہی ہیں بھلا؟" مجھے اماں کے انداز پر ہنسی آگئی۔

"اے لو۔ بھلا کوئی ہمیشہ بیٹھا رہتا ہے؟" اماں نے چمک کے کہا۔ "عجیب لڑکا ہے، سمجھتا ہی نہیں۔"

"اچھا بھئی، جیسا آپ چاہیں۔" میں نے اماں کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔

☆☆☆

اماں نے جو لڑکی میرے لیے پسند کی اس کا نام زلیخا تھا جو عام سی شکل صورت کی لڑکی تھی جس کی سب سے بڑی خوبی اس کی کم گوئی اور اطاعت شعاری تھی۔

اس نے مجھ سے پہلے اماں کے دل میں گھر کرلیا۔ اماں نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ ماجد نے آٹھویں سے پڑھنا چھوڑ دیا تھا اور اپنے ابا کے ساتھ کام میں لگ گیا تھا۔

اس نے جواب دیا۔ "جو مرد کام کرتے ہیں وہ کم ہی پڑھتے ہیں۔ میرا تو کوئی بھائی بھی پانچویں سے آگے نہیں پڑھا۔ تینوں کے تینوں خوش حال ہیں۔ ہنر مند ہیں اس لیے۔"

اماں نے کہا۔ "مگر دلہن! تم تو انٹر پاس ہو۔"

زلیخا بولی۔ "تو کیا ہوا اماں۔ ہماری تعلیم تو بس گھر سے نکلنے کا بہانہ ہوتی ہے اس لیے لڑکیاں پڑھ جاتی ہیں۔ ہمیں بھی آزادی سے گلی کے نکڑ پر کھڑے ہونے کا حق دیں۔ راتوں کو باہر رہیں۔ یار دوستوں کے ساتھ وقت گزارنے کا کھلا ڈلا موقع دیا جائے پھر دیکھیں لڑکیاں کتنا پڑھتی ہیں۔ روٹی گول نہ بنے تو ڈگری کی ذلت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ میری بہن کو اولاد نہیں ہوئی۔ بی اے کی ڈگری نے اس کو طلاق ملنے سے نہیں روکا۔"

اماں نے کہا۔ "ٹھیک کہتی ہو۔ خالی تعلیم نہیں، مقدر بھی ہوتا ہے اور میں نے تو یہی دیکھا ہے کہ عورت ڈگری

JUNOVELS.COM

سے کم اور نصیب سے زیادہ راج کرتی ہے۔''

میں اطمینان سے دونوں کی گفتگو سنتا رہا۔

حیرت انگیز طور پر زلیخا کے انداز میں کوئی تلخی، کوئی گلہ، کوئی شکوہ نہیں تھا بلکہ اس کے انداز میں ایسا تاثر تھا جیسے یہ ساری باتیں کسی غیر متعلقہ فرد کے بارے میں ہو رہی ہوں۔

زلیخا تو اس وقت بھی بڑے اطمینان سے بولی تھی جب میں نے اس سے کہا تھا کہ اگر تم بُرا نہ مانو تو میں تمہیں زوبی کہہ لوں؟

''جیسے آپ کو اچھا لگے۔''

اس اللہ کی بندی نے پلٹ کر نہیں پوچھا کہ میں اس کو زلیخا کے بجائے زوبی کیوں کہنا چاہتا ہوں اور پھر بعد کے دنوں نے ثابت کیا کہ وہ ایسی موم کی عورت تھی جو کہ نا صرف اماں کے ارادوں میں ڈھل گئی بلکہ اس نے مجھ سے بھی کبھی کسی فرمائش، کسی آرزو کا اظہار نہیں کیا۔

☆☆☆

میرا پہلا بیٹا شادی کے ٹھیک دس ماہ کے بعد ہوا..... وہ ہو بہو میری کاپی تھا۔

''پہلا بچہ شوہر پر جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ بیوی کو شوہر سے بہت محبت ہے۔'' اماں نے کہا۔

میں خوش تھا کہ میری تکمیل کا سفر شروع ہو رہا ہے۔

''سنا آپ نے..... اماں کیا کہہ رہی ہیں؟'' میں نے زلیخا سے کہا۔

''جی.....'' اس نے آہستہ سے کہا اور چپ ہو گئی۔

''کیا تم خوش نہیں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں بہت خوش ہوں۔'' وہ دھیمے سے بولی۔ ''اماں نے پوری بات نہیں کی۔''

''کون سی بات؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''وہی جو اماں کہہ رہی ہیں کہ اگر پہلا بچہ شوہر کی شکل پر جائے تو بیوی کی محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ پھر شوہر کی محبت کا کیسے پتا چلے گا؟'' اس نے پوچھا اور میری طرف دیکھا۔

میں حیران رہ گیا۔ پتا نہیں کیوں میں اس وقت سوچ رہا تھا کہ اگر زلیخا کی جگہ زوبی ہوتی تو.....

''کیا بات ہے؟'' اس نے مجھے چونکا دیا۔

میں چپ رہا۔ مجھ سے کچھ نہ بولا گیا۔

وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کے لب خاموش تھے اور آنکھیں بے تاثر۔ پھر اس نے کروٹ بدلی اور بچے کو دودھ پلانے لگی۔

میں کمرے سے باہر نکل آیا اور چھت پر جا بیٹھا۔

☆☆☆

گزرتے وقت نے پھر ہمارا ایک بڑا نقصان کر دیا۔ ابا کی طبیعت رات کے وقت خراب ہوئی۔ انہیں اسپتال لے کر گئے مگر وہ چند ہچکیاں لے کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے کبھی یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ ابا یوں اچانک مر جائیں گے۔ ساری عمر انہیں چاق و چوبند دیکھا تھا۔ ہنستے مسکراتے، باتیں کرتے۔ مجھے یاد نہیں کہ ابا کو دو چار دن بھی بخار میں دیکھا ہو۔ پھر اچانک یہ کیا ہو گیا؟

میں ہی ابا کے سب سے زیادہ قریب تھا بلکہ ابا اور اماں دونوں ہی سے، میں ہی سب سے زیادہ قریب تھا اور ہم دونوں ہی کو بہت دنوں تک نہ مجھے، نہ اماں کو یقین آیا کہ ابا چلے گئے ہیں۔

اماں کی خالی اداس ویران آنکھیں، ان کی آواز کا وہ کراراپن جیسے ڈھیلے سے لہجے میں تبدیل ہو گیا۔

ہم سب بہن بھائی اپنے اپنے گھروں کے تھے۔ سب کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ ابا سب کے فرائض پورے کر گئے تھے۔

کبھی کبھی میں اماں سے کہتا۔ ''ویسے تو ابا کو کوئی بیماری کوئی تکلیف نہیں تھی، اللہ نے ان کے سارے فرائض پورے کرا دیے۔ پچھلے سال آپ اور ابا حج بھی کر آئے تھے۔''

اماں نے بلک کے کہا۔ ''ہاں، اپنے بچوں کے سارے فرائض پورے کر گئے۔ میرا فرض تو باقی رہ گیا۔ تنہا کر گئے۔''

''آپ کا فرض؟'' میں حیران ہو گیا۔

''ارے تجھے کیا پتا، عورت اپنے شوہر کے ہاتھوں دفن ہو تو اس کا فرض پورا ہوتا ہے۔ ہائے، میں کیسی بدقسمت ہوں کہ تیرے باپ کے ہاتھوں کی مٹی بھی مل نہ سکی مجھ بدنصیب کو۔'' اماں نے کہا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو تواتر سے بہنے لگے۔ محبت کا یہ انداز دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

میں نے بے اختیار پوچھا۔ ''آپ اتنی محبت کرتی تھیں ابا سے؟''

اماں نہ جانے کس جنون میں تھیں، کہنے لگیں۔

''ہائے تو کیا جانے تیرے ابا کتنے اچھے، کتنے سادہ تھے۔ مجھے ان کی سادگی ہی تو اچھی لگی تھی۔ تیرے ابا ٹھیلے پر سبزیاں بیچتے تھے۔ گلی گلی آوازیں لگا کے، ان کے گلے میں بڑا سوز تھا۔ ایسے پُرسوز گانے گاتے تھے..... محمد رفیع کے، کشور کے اور اپنے مہدی حسن کے۔ میں تو ان کے انداز پر

ہی مرمٹی۔"

اماں کی آنکھیں بھر گئیں اور وہ رونے لگیں۔ بے آواز۔ یہ محبت بھی کتنی عجیب ہوتی ہے۔ اماں کو گلہ تھا کہ ابا نے انہیں پہلے چھوڑ دیا ورنہ ان کی ذمے داری تھی کہ وہ انہیں اپنے ہاتھوں سے دفناتے۔

محبت بھی کیا چیز ہوتی ہے؟

☆☆☆

زلیخا بڑی بھاگوان عورت ثابت ہوئی۔ میری آڑھت بڑھتی رہی۔ میں منڈی کا خاص بیوپاری بن گیا۔ اللہ نے دو بیٹے اور ایک بیٹی بھی دے دی۔ روپے، پیسے کی کمی نہیں تھی لیکن اوچھا پن نہیں تھا۔

آج بھی مجھے اپنے پرانے محلے میں رہنا اچھا لگتا تھا۔ میرا واحد دوست نذیر بھی اسی محلے میں تھا۔ البتہ اس کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی کرخت آواز والی اماں اب کمر جھکا کے دھیرے دھیرے چلتی تھیں۔ سہ پہر کو میں اور نذیر بیٹھک میں بیٹھے پرانی یادوں کو تازہ کرتے رہتے تھے۔

زبیدہ کا مکان ابھی تک خالی تھا۔ میں اس واقعے کے بعد کئی دن نذیر سے ناراض رہا تھا کہ اس نے مجھے حیدرآباد جانے کا جھوٹا آسرا کیوں دیا تھا مگر پھر نذیر نے مجھے منالیا تھا۔

نذیر ابھی تک اسی طرح شوخ تھا۔ ہنستا مسکراتا تھا۔ اس کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ بڑے لڑکے نے اپنی پسند کی شادی کی تھی اور شہر کے مشرقی حصے میں اپنا پلاسٹک اسٹور کھول لیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اب کباڑیے بھی فیشن ایبل ہو گئے ہیں۔ وقت بدل رہا ہے۔ ہمیں بھی بدلنا چاہیے۔

"الو کے پٹھے! کل باپ بھی بدل لینا۔" نذیر نے غصے سے چیخ کر کہا۔

"ابا! زیادہ نہ چیخیں، آپ کا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے۔" اس کے بڑے لڑکے قدیر نے کہا اور میری طرف رخ کر کے بولا۔ "چاچی! آپ ابا کو سمجھائیں نا۔"

"اب اس عمر میں تو مجھے سمجھائے گا۔" نذیر نے غصے سے کہا۔

"میں تو سمجھا سکتا ہوں مگر آپ نہیں مانتے تو میں کیا کروں؟" قدیر نے کہا اور باپ کے کباڑ میں سے پرانا پیتل کا لیمپ پلاسٹک کے بڑے شاپر میں رکھنے لگا۔

"خبردار جو اس کو ہاتھ لگایا تو۔" نذیر نے غصے سے کہا۔ "پورے تین سو روپے کا ہے۔ جب جی چاہے منہ اٹھائے آتا ہے اور جو جی چاہے لے جاتا ہے۔ مفت میں کچھ نہیں ملتا۔"

"ابا یہ لو....." قدیر نے جیب سے سو سو کے نوٹ نکالے اور گن کے تین سو روپے نذیر کی طرف بڑھائے۔

"لعنت ہے تجھ پر....." نذیر نے ہاتھ مار کے پیسے نیچے گرادیے۔ "مجھے پیسوں کی ضرورت ہے کیا؟"

"ابھی تو پیسوں کو رو رہے تھے۔" قدیر نے قہقہہ لگایا۔

دونوں باپ بیٹوں میں یہ جھگڑا، یہ منظر باقاعدگی سے دوسرے تیسرے دن دہرایا جاتا تھا اور عموماً میں ہی اس کا گواہ ہوتا تھا۔

وہ ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے پیسے اٹھائے اور زبردستی باپ کی جیب میں ڈال گیا۔

"ایک نمبر کا فراڈیا کمینہ ہے۔" نذیر نے غصے سے کہا اور ہنسنے لگا۔

"کیا کرے گا یہ لیمپ کا؟" میں نے پوچھا۔

"تو تو یوں پوچھ رہا ہے جیسے جانتا نہیں۔" نذیر میری طرف دیکھ کے ہنسا۔ "پالش کروائے گا۔ کسی سے دو چار سو سال پہلے کا اس کے چندے میں سن کھدوائے گا اور چار پانچ ہزار میں نوادرات میں شامل کر کے بیچ دے گا۔"

"لوگ ہی بے وقوف ہیں۔" میں نے تاسف سے کہا۔

اندر سے اس کی بیوی کھانے کے لیے دہی بڑے ٹرے میں لے کر آئی اور مجھ سے بولی۔ "آپ ان کو سمجھاتے کیوں نہیں۔ کیوں ہر وقت بیٹے کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ دیکھیں آٹھ برس میں اس نے ہم سے اچھا بڑا دو منزلہ مکان بنالیا ہے۔ وہ کہتا ہے ہم اس کے پاس چلیں مگر یہ مانتے ہی نہیں۔"

"میں تو اس گھر سے کہیں نہیں جاؤں گا۔ تم کو جانا ہو تو چلی جاؤ۔ بیٹے کی محبت پھٹی پڑ رہی ہے۔" نذیر کے لہجے میں چڑچڑاہٹ تھی۔

"بھلا میں تمہیں چھوڑ کے کہاں جاسکتی ہوں مگر یہ بھی تو دیکھو کتنا خیال کرتا ہے وہ ہمارا۔"

"وہ بھی ہمیں لے جانے میں سنجیدہ نہیں۔" نذیر نے کہا۔ "اس کے لیے میں سونے کی کان ہوں۔ شہر بھر کے لوگ اپنا کاٹھ کباڑ ہمیں دے جاتے ہیں اور وہ ہم سے اپنے مطلب کی چیزیں سمیٹ کر چلتا بنتا ہے۔"

"کتنی ہی بار تو اس نے پیسے دینے کی کوشش کی مگر تم لیتے ہو بھلا؟"

"اب میں اس سے کاروبار کروں گا، پاگل ہو گئی ہے کیا؟" نذیر ہنسنے لگا۔ نذیر کا چھوٹا بیٹا نصیر ایک فیکٹری میں ملازمت کرتا تھا۔ اس کی لگی بندھی تنخواہ تھی جو وہ باقاعدگی

UUNOVELS.COM

سے باپ کے ہاتھ پر لا کے رکھ دیتا تھا۔

ان کی یہ روز روز کی بک بک، جھک جھک مجھے اچھی لگتی تھی۔ خصوصاً نذیر کی بیوی کا اپنے میاں سے لڑنا اچھا لگتا تھا اور اس دوران بار بار زبیدہ کی کھڑکی دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ جو کبھی نہیں کھلتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں مجھے ہمیشہ اپنی زوبی کھڑی دکھائی دیتی تھی۔

ہماری گفتگو کے دوران جب بھی کوئی وقفہ آتا یا نذیر کبھی کسی ضرورت سے اندر جاتا تو کوئی نادیدہ قوت میری گردن کو کھڑکی کی سمت موڑ دیتی تھی پھر میری اس خالی کھڑکی سے باتیں شروع ہو جاتی تھیں۔ جن کا سلسلہ نذیر کی آمد اور زور سے کھنکھارنے سے ہی ٹوٹتا تھا اور میں اپنی محویت پر جھینپ جاتا تھا۔

کبھی کبھی نذیر کی بیوی کہتی۔ ''یہ آپ دونوں اکثر اس کھڑکی کی طرف کیا دیکھتے رہتے ہیں؟''

''وہاں ایک پری رہتی تھی اپنی ماں کے ساتھ۔'' نذیر ڈرامائی انداز میں کہتا۔

''پری میری طرح!'' نذیر کی بیوی ہنستی۔

''ہاں تمہاری طرح۔'' نذیر ہنستا۔ ''بس معمولی سے فرق کے ساتھ۔''

''کون سا فرق؟''

''یہی کہ وہ پری تھی..... تم چڑیل۔'' نذیر بولتا اور پھر بلند آہنگ قہقہے سے بیٹھک گونج جاتی۔

نذیر کی بیوی غصے سے پیر پٹختی ہوئی چلی جاتی اور پھر تھوڑی دیر بعد چائے کے ساتھ واپس آ جاتی۔

☆☆☆

دن رات یونہی گزر رہے تھے۔

ابا کے انتقال کے تین سال کے بعد اماں کا بھی انتقال ہو گیا۔ وہ سب سے زیادہ زلیخا سے خوش تھیں۔

''ماجد.....'' وہ مجھے کہتیں۔ ''تجھے جنت کی حور مل گئی ہے۔ اتنی تابعدار، خاموش طبع اور ہر معاملے میں تیری رضا کو مقدم جاننے والی ہے۔ اس کی قدر کرنا۔ اس کو دکھ نہ دینا۔''

''میں کیا کروں، کیا کہوں گا۔ کبھی میں نے گھر کے معاملے میں کوئی مداخلت کی ہے؟'' میں نے اماں کو ہمیشہ دلاسا دیا۔ ''اور آپ ایسی مایوسی والی باتیں نہ کیا کریں، ابھی تو آپ نے اپنے پوتوں پوتیوں کی کتنی ہی خوشیاں دیکھنی ہیں۔''

''بس تم لوگوں کی خوشیاں دیکھ لیں، یہی کافی ہے۔'' وہ ہنس کر بولتیں۔

مگر ان کے لہجے سے گھن گرج، زندگی کی رونق معدوم ہو رہی تھی اور پھر ایک رات ذرا سی گھبراہٹ ہوئی اور وہ چند ہی لمحوں میں رخصت ہو گئیں۔

☆☆☆

اماں کیا گئیں جیسے گھر میں اداسی چھا گئی۔ میرا بڑا بیٹا اپنی دادی کا بہت لاڈلا تھا اور اسی لاڈلے پن کی وجہ سے مزاج کی تیزی اس کی شخصیت کا حصہ بنتی جا رہی تھی۔ سولہ برس کا تھا۔ قد کاٹھ اللہ نے اچھا دیا تھا۔ پورا جوان مرد لگتا تھا۔ پھر باقی بہن بھائی بھی قدبت کے اچھے تھے۔

ایک رات میں اپنی ٹانگوں میں..... مالش کروا رہا تھا کیونکہ اب گھٹنوں میں درد رہنے لگا تھا دن بھر کی چلت پھرت میں شام تک پیروں میں سوجن آ جاتی تھی۔ نیم گرم نمک ملے پانی میں تھوڑی دیر پاؤں ڈال کے سکون ملتا تھا۔ پھر رمضو جو ہمارے پاس اوپر کے کام کاج کے لیے تھا، وہ پیروں کی مالش کر دیتا تھا۔

زلیخا اندر آئی تو خاموشی سے بیٹھ گئی۔ جب اس کو کوئی خاص بات کرنی ہوتی تھی، وہ چپ چاپ آ کے پاس بیٹھ جاتی تھی اور انگلیاں مروڑتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ایسا ہی کر رہی تھی۔

''کہو کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کے لیے چائے لاؤں۔'' اس نے مجھ سے پوچھا اور پھر رمضو کی طرف دیکھا۔

''لے آؤ۔'' میں سمجھ گیا کہ وہ رمضو کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتی۔

وہ اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے پیر سکیڑے۔ ''چلو بھئی رمضو میاں اب تمہاری چھٹی۔''

''اچھا جی.....'' وہ فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔

رمضو کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی زلیخا چائے لے آئی۔ میں نے چائے کا کپ تھامتے ہوئے پوچھا۔

''بولو کیا بات ہے؟''

''میں ریحان کی طرف سے فکرمند ہوں۔'' زلیخا نے دھیمی آواز سے کہا۔

''کیوں کیا ہوا؟ کیا تم سے کوئی بدتمیزی کی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ مجھے ریحان کے مزاج کا اندازہ تھا۔ ضدی اور منہ پھٹ تو وہ تھا ہی۔

''کہتا ہے اب نہیں پڑھوں گا۔ میری شادی کر دو۔''

''کیا.....؟'' مجھے بہت حیرت ہوئی۔ ''یہ کس قسم کی باتیں کر رہا ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے..... صرف سولہ برس۔''

UUNOVELS.COM

''انیس برس.....'' زلیخا نے میری تصحیح کی۔ ''آپ تو بچوں کی عمریں ہی بھول جاتے ہیں۔ ماشاء اللہ تحریم سولہویں برس میں ہے اور فرحان پندرھویں میں۔ سب ہی یکے بعد دیگرے جوان ہو رہے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ان کے لیے کچھ سوچیں۔''

''کیا سوچوں؟ انہوں نے تو خود سوچ لیا۔'' مجھے سچ مچ غصہ آنے لگا۔ ''یعنی کہ نہ پڑھنا نہ لکھنا بس شادی کا شوق۔''

''یہ آج کل کے بچے ہیں۔ ہماری طرح نہیں۔ جب اچھے اسکولوں میں پڑھائیں گے تو فیصلہ سازی بھی سیکھیں گے۔'' زلیخا نے بڑے آرام سے کہا۔

میں نے چونک کے زلیخا کی طرف دیکھا۔ اس کی گفتگو میں بڑا ٹھہراؤ اور سمجھ داری کا عنصر ہوتا تھا۔

''کیا بات ہے، آج تو تم بہت سمجھ داری کی باتیں کر رہی ہو۔'' میں نے چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ بھرا۔

''باتیں تو عام سی ہیں۔'' زلیخا نے کہا۔ ''یہ تو توجہ دینے پر ہے۔''

اس کا لہجہ بے حد سادہ تھا۔

''کیا تم ناراض ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں بھلا، ناراض ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں۔''

''ہاں.....'' میں نے کہا پھر ذرا ٹھہر کے پوچھا۔ ''وہ لڑکی کون ہے جس سے شادی کا کہہ رہا ہے ریحان؟''

''اس کی کلاس فیلو ہے۔ وہ بھی تیار ہے مگر اس کی ماں کہتی ہے کہ ابھی تم کچھ کام نہیں کرتے تو میں رشتہ کیسے دوں؟''

''اچھا تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے۔'' مجھے افسوس ہوا۔ ''میں بات کرتا ہوں اس سے۔''

''کیا بات کریں گے کہ شادی کیوں کرنا چاہتا ہے؟'' زلیخا نے پوچھا۔

''پھر.....؟'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''جوان اولاد سے دو بدو بات کرنے کے بجائے اس لڑکی کو دیکھیں، اگر اچھی لڑکی ہے تو ہاں کر دیں۔ شادی تو کرنی ہے۔ کہیں بھی کرنی ہے، اب اگر اس کی پسند شامل ہو جائے تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟'' زلیخا نے آہستہ سے کہا۔

''تم نے لڑکی دیکھی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔'' زلیخا نے سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر چپ رہی پھر بولی۔ ''ایک دن لے آیا اس کو موٹر سائیکل پر بٹھا کے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ آپ کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون ہے تو اس نے کہا امی یہ عارفہ ہے۔ میری کلاس فیلو۔''

''پھر تم نے کیا کہا؟'' مجھے پھر غصہ آنے لگا۔

''میں کیا کرتی؟'' زلیخا نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ ''میں نے چائے پانی کا پوچھا۔ کھانا کھلایا۔ وہ چھریرے بدن کی تیکھے نین نقش والی لڑکی ہے۔ اچھی ہے۔'' زلیخا نے کہا۔

''گھر لانے کی ہمت ہوئی ہے تو پھر مزید پیش قدمی بھی کی ہوگی۔''

''ہاں.....'' زلیخا نے کہا۔ ''بہتر ہے کہ آپ ٹھنڈے دل سے فیصلہ کریں۔ میں نے تو سوچا ہے کہ لڑکی کی شادی بھی کر دوں۔''

''لڑکی..... کون لڑکی؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیا ہو گیا ہے آپ کو؟'' وہ ماتھے پر ہاتھ مار کے بولی۔ ''میں تحریم کی بات کر رہی ہوں۔ اس کا قد کاٹھ دیکھا ہے آپ نے۔ بالکل برابر کی لگتی ہے وہ میرے ساتھ۔''

''مگر اس کا اس مسئلے سے کیا تعلق؟'' میں نے کہا۔

''لڑکی ہے۔ بھائی کی محبت دیکھے گی تو کل کو اس کے دل میں بھی کوئی خیال آ سکتا ہے۔ اب کیا لڑکی اور لڑکا ہمارے لیے برابر نہیں؟'' زلیخا نے کہا۔

''بھس میں چنگاری پڑ جائے تو سب کچھ راکھ ہو جاتا ہے۔ پاس پانی بھی پڑا ہو تو وہ آگ نہیں بجھاتا، ابل جاتا ہے۔''

میں حیرت سے زلیخا کو دیکھنے لگا۔ کتنی خاموش کتنی گہری تھی وہ.....

''تو تحریم کا رشتہ کہاں کرنے کا ارادہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بھائی جان مانگ رہے ہیں..... اپنے لڑکے کے لیے۔'' زلیخا نے میرے بڑے سالے کا نام لیا۔ ''اس نے ماسٹر کر لیا ہے۔ بہت اچھی نوکری ملی ہے بینک میں۔''

''اچھا۔''

''میں تو کہتی ہوں کہ دونوں کو ساتھ ہی نمٹا دیں۔ خرچ کم ہوگا۔ دونوں کا تیل مہندی ایک ساتھ ہو جائے گا۔ پھر ایک کی برات، ایک کا ولیمہ۔'' لگتا تھا کہ سارا پلان زلیخا کے ذہن میں واضح تھا۔ وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔

میں خاموش رہا اور سوچتا رہا کہ میرے ہی گھر میں، میری ہی اولاد نے مجھے کس قدر غیر متعلق کر دیا ہے اپنے معاملات سے۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟'' زلیخا نے پوچھا۔

''جو تم کو مناسب لگے وہ کر لو۔ عملاً تو فیصلہ تم لوگ کر ہی چکے ہو۔''

UUNOVELS.COM

''غصہ نہ کریں۔ بات کو سمجھیں۔'' زلیخا نے تحمل سے کہا۔ ''یہ سب میں اس لیے کر رہی ہوں کہ بات باہر نہ پھیلے۔ بلاوجہ کی بدنامی نہ ہو اور پھر جذباتی معاملات میں اولاد کے دل میں والدین کے خلاف گرہ پڑ جائے تو بہت مشکل سے جاتی ہے۔''

''میں ناراض نہیں ہوں لیکن افسوس ضرور ہے کہ میری اولاد کے لیے میرے فیصلے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میں ان کے لیے رشتے ڈھونڈنے کی زحمت سے بچ گیا۔ ذرا چھوٹے سے بھی پوچھ لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی کہیں دل دے بیٹھے ہوں اور ایک دن بھائی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے آپ ہی کوئی بیاہ لائیں۔''

''آپ غصے میں ہیں۔ آرام کیجیے۔'' زلیخا نے کہا۔

''بلاوجہ کی سوچوں میں خود کو ہلکان کرنے کا فائدہ؟''

''یہ تو والدین کا فرض ہے۔'' اس نے اسی تحمل مزاجی سے کہا۔ ''ذرا سچ بتایئے کہ آج تک آپ نے اپنے بچوں کے لیے رشتے کا کبھی خود سے سوچا؟''

زلیخا کا سوال ایسا تھا کہ میں چپ ہو گیا۔

واقعی میں نے تو کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ مجھے بچوں کی شادیاں بھی کرنی ہیں۔ میں تو انہیں ابھی تک بچہ ہی سمجھ رہا تھا مگر وہ ہمیں سمجھا رہے تھے کہ ہم بچے نہیں ہیں بلکہ بچے کے باپ بننے کی چاہ میں ہیں۔

☆☆☆

میں نے زلیخا کے کہنے پر عارفہ کے گھر والوں کو رات کے کھانے پر بلا لیا۔ عارفہ خوش مزاج تھی مگر اس کے مزاج میں تیزی تھی۔ اس کی ماں اور باپ دونوں ہی درمیانے سے معاشی حالات میں زندگی گزار رہے تھے لیکن میں نے محسوس کیا کہ عارفہ کی ماں اپنے شوہر پر حاوی ہے۔ مجھے عارفہ کا باپ جو کہ ایک پرائیویٹ کمپنی میں کلرک تھا، ایک خاموش طبع شخص نظر آیا۔

عارفہ کی ماں نے کہا۔ ''بہن، میں یہ وضاحت کر دوں کہ میں جہیز دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ سچ پوچھیں تو ہمارے لیے تو آپ کی یہی نیکی ہو گی کہ آپ شربت کے پیالے پر ہی دو بول پڑھوا کے رخصت کرا لیں۔''

زلیخا بولی۔ ''ہمیں جہیز کی کوئی طلب نہیں۔ ہمیں تو بس اچھی فیملی اور ذمے دار بہو چاہیے۔''

''اب سترہ برس کی عمر میں لڑکی میں کتنی ذمے داری، کتنی سمجھ داری ہو گی بھلا آپ ہی بتائیں۔'' عارفہ کی ماں نے ترش سے جواب دیا۔ ''بیٹیاں تو ابھی قد نکالتی نہیں ہیں کہ ہم ان پر شادی کی ذمے داری لاد دیتے ہیں۔'' اس کا لہجہ کرخت تھا۔

''صحیح کہہ رہی ہیں آپ۔'' میں نے مداخلت کی۔ ''لیکن جب یہ اٹھارہ بیس برس کے لڑکے لڑکیاں اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنے لگیں تو ان کو اپنی اپنی ذمے داریاں اٹھانے کی بھی عقل ہونی چاہیے۔''

''جی.....'' میری بات کے جواب میں عارفہ کی ماں ایک جی کہہ کر چپ ہو گئی۔

ان ہی باتوں میں کھانا ختم ہو گیا اور وہ لوگ رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد ریحان میرے پاس آیا۔ تھوڑی دیر وہ میرے پاس بیٹھا رہا پھر کہنے لگا۔

''شکریہ ابو۔''

''کس بات کا شکریہ؟'' میں نے بے اعتنائی سے کہا۔

''آپ نے میری خواہش کو پورا کر دیا۔''

''اور تم نے مجھے اپنے معاملے میں شریک ہی نہیں کیا۔''

''مجھے ڈر تھا کہ آپ انکار کر دیں گے۔'' وہ آہستہ سے سر جھکا کے بولا۔

''ہاں.....'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں ضرور منع کرتا مگر میں جانتا ہوں کہ تم عمر کے اس حصے میں ہو جہاں نصیحت سب سے بڑی فضیحت لگتی ہے اور سمجھانے والا بُرا ہی نہیں دشمن ہوتا ہے اگرچہ وہ باپ ہی کیوں نہ ہو۔''

وہ خاموش رہا۔ زلیخا نے کہا جو خاموش کھڑی سب سن رہی تھی۔

''اب اس خوشی کے موقع پر تو ایسی باتیں نہ کریں۔ بچے کا دل ٹوٹ جائے گا۔''

''اچھا۔'' میں نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔ ''اگر یہ بچہ ہے تو اس کو ابھی سمجھا دو، اگر اس نے اپنی سسرال کے درمیان میں فاصلہ نہ رکھا تو وہ عورت اس پر حاوی ہو جائے گی۔ بیوی اچھی ہو یا بری، گزارہ تم نے کرنا ہے لیکن تمہارا انتخاب.....'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''بہرحال میں اس کو معیاری نہیں کہہ سکتا۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔ کامیاب رہو۔'' میں نے جواب دیا۔

''اتنی باتیں سنانے سے بہتر تھا کہ آپ منع ہی کر دیتے۔'' ریحان نے منہ بنا کے کہا۔

''اگر تم نے فیصلہ کیا ہے تو ڈٹے رہو۔ میری آڑ مت لو۔ میں تو سبزی دیکھ کر بتا دوں کہ کب تک کھلے گی اور کب بیٹھ جائے گی۔ بیٹا! انسان چند باتوں سے پہچانا جاتا ہے مگر

UUNOVELS.COM

جذبات کی رنگین عینک سارے سیاہ سفید بدل دیتی ہے۔"

"اچھا.... اچھا.... چھوڑیں یہ باتیں! یہ بتائیں کہ چائے پئیں گے؟" زلیخا نے گھبرا کر کہا۔

"ضرور۔" میں نے کہا۔

ریحان تھوڑی دیر کھڑا اپنے ہونٹ چباتا رہا پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد زلیخا نے آہستہ سے کہا۔

"جب آپ نے کہہ دیا تھا کہ انہیں بلالو پھر بچے کا دل اپنی طرف سے بُرا کیوں کرتے ہیں؟"

"سمجھانا میرا کام تھا۔ باقی اس کی مرضی۔ میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ڈالوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"جب سب کرنا ہی ہے تو بچے کا دل بُرا نہ کریں۔" اس نے کہا اور تھوڑی دیر مجھے کھڑی دیکھتی رہی پھر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

میرے بڑے سالے نے بھی اپنے بیٹے کا باقاعدہ رشتہ دے دیا۔

میں نے دونوں کی شادی کا فیصلہ سال بھر کے بعد کرنے کا فیصلہ کیا۔ ریحان کی خواہش تھی کہ وہ جنرل اسٹور کھولے۔ میں نے اس کو جنرل اسٹور کھلوا دیا۔ وہ تن دہی سے اس میں لگ گیا۔

اس دوران میں ہم نے فیصلہ کیا کہ مکان کی توسیع کر دی جائے۔ ہم دونوں میاں بیوی نیچے کے پورشن میں رہیں اور اوپر دو منزلیں بنا کر ریحان اور فرحان کے لیے پورشن بنا دیں تاکہ پہلے ہی دن سے وہ اپنی زندگی کی خلوت میں ہماری مداخلت سے پریشان نہ ہوں۔

"لیکن کبھی یہ نہ سوچے گا کہ ان کا کھانا پینا بھی علیحدہ ہو۔" زلیخا نے کہا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟"

"شاید آپ عارفہ کی عادتوں کو پسند نہ کریں۔" اس نے کہا۔ "آج کل کی لڑکیاں زیادہ تر اپنی مرضی کی مالک ہوتی ہیں۔" وہ بولی۔

"کیا تمہیں اپنی تحریم سے کبھی کوئی ایسا خدشہ لاحق ہوا کہ وہ اپنے میاں کو لے کر الگ ہو جائے گی؟" میں نے سوال کیا۔

وہ تیزی سے بولی۔ "میری تحریم ایسی نہیں۔"

"خالی تمہاری تحریم کا مسئلہ ہی نہیں۔ اس میں تمہاری تربیت کا بھی ہاتھ ہے۔ جو وہ اس نہج پر نہیں سوچے گی۔ یہی فرق ہے جو میں واضح کرنا چاہتا تھا۔ شکر ہے کہ تم نے خود محسوس کر لیا ہے۔"

وہ خاموش رہی۔

میں نے پھر کہا۔ "تمہیں ایک بات بتاؤں۔"

"جی...." اس نے آہستہ سے کہا۔ "کہیے۔"

"والدین اولاد کو کبھی الگ نہیں کرتے۔ الگ ہونے کی خواہش کے تانے بانے بیوی کی سوچ سے جنم لیتے ہیں۔ عورت کی گھر کی خواہش اور حاکیت کی آرزو بری بات نہیں لیکن یہ چیزیں وہی عورت سمجھتی ہے جس نے اپنا آپ مار کے زمانے کی سختیاں جھیل کر حکمرانی کے گر سیکھے ہوں ورنہ پھر نسلیں بے کہے شتر بے مہار کی صورت والدین کی ہی نہیں، اپنی بھی زندگی حرام کر لیتی ہیں۔"

"آپ اتنا زیادہ گہرا نہ سوچا کریں۔" زلیخا دھیمے سے ہنسی۔

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ پتا نہیں میرے دیکھنے میں کیا تھا کہ اس کے رخسار تپ گئے۔

"کیا بات ہے، آج تو آپ بہت عالموں کی طرح گفتگو کر رہے ہیں؟"

"تم اچھی لگ رہی ہو۔" میں نے کہا۔

میری بات سن کر اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے اسے میری دماغی صحت پر شبہ ہو رہا ہو۔

"آج تو آپ بہت عجیب سی باتیں کر رہے ہیں۔ جن باتوں کو کبھی نہیں کہا، اب ان کو کہنے سے کیا حاصل؟" اس نے دھیمے سے کہا۔ "میری عادت نہ بگاڑیے۔ میں ایسے ہی بھلی ہوں۔ محبت کی عادت اور خیال کا دھیان رہنے لگے تو پھر جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔"

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

کیا میں نے زلیخا کو سمجھنے میں غلطی کی تھی یا وہ رازوں بھری پوٹلی تھی جس کو میری توجہ کھوج رہی تھی؟

میں سوچتا رہ گیا۔ وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

☆☆☆

ریحان اور تحریم دونوں بہن بھائی کی شادیاں کر دیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ زلیخا نے کیسے اور کس طرح تیاریاں کیں۔ مجھے تو بس پیسے دینے سے کام تھا مگر ایک کام اس نے بڑا عجیب کیا۔ اس نے اپنی خریداری کی فہرست میں فرحان کو بھی شامل رکھا۔ پتا نہیں کیا کیا چیزیں اس نے فرحان کی ہونے والی بیوی کے لیے خرید لی تھیں۔

"کیا ہوا تمہیں جو ابھی سے تم فرحان کے لیے بھی

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

تیاریاں کر رہی ہو؟''

''فرحان میرا لاڈلا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کے لیے بھی جلدی سے دلہن لے آؤں۔''

''اب اس طرح نہ کرو۔ تمہیں تو بس شادیوں کا شوق ہے۔ اب ایسا نہ ہو کہ بچوں کی شادی سے فارغ ہو کر میرے لیے دلہن ڈھونڈنا شروع کر دو۔'' میں نے مذاق میں کہا۔

وہ بولی۔ ''آپ نے کبھی اپنے دل کی بات مجھے بتائی ہی نہیں۔ ورنہ میں تو یہ بھی کر گزروں۔''

''اچھا.....'' میں نے اسے مزید تنگ کرنے کی نیت سے کہا۔ ''کیا آدھا آدھا بٹوارا قبول کر لو گی؟''

''بٹوارے کی میں قائل نہیں۔'' اس نے اپنی روایتی نرمی سے کہا۔ ''میں تو سارا کا سارا اسے سونپ دوں گی۔ جب عورت مرد کا بٹوارا کرتی ہے تو مرد امتحان میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ انصاف کے خوف میں پڑ جاتا ہے۔ میں تو آپ کو کسی امتحان، کسی خوف میں ڈالنا ہی نہیں چاہتی۔''

''تمہیں مجھ سے اتنی محبت ہے؟'' میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔ ''تم نے کہا نہیں کبھی۔''

''ہر بات کہنے کی نہیں ہوتی۔'' وہ آہستگی سے بولی۔ ''جو محسوس نہ کیا جا سکے، اس جذبے کو چیخ چیخ کر بیان کرنے سے کیا حاصل؟'' زلیخا نے کہا۔ ''میں اگر آپ کو نہیں کہہ پائی تو آپ بھی تو مجھ کو سمجھ نہ پائے۔''

میں ہکا بکا اس کو دیکھتا رہ گیا۔ یہ وہ زلیخا تو نہ تھی جو میرے ساتھ رہتی تھی۔ یہ تو کوئی اور زلیخا تھی۔ نئی نئی سی۔ مگر میں نے تو اس کو کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ میرے ساتھ جسمانی طور پر زلیخا اور جذباتی طور پر آج بھی زبیدہ رہتی تھی۔ زوبی رہتی تھی۔

یہ میں کہاں الجھا ہوا تھا؟ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرا خالی تھا۔ زلیخا باہر جا چکی تھی اور کمرا صرف میرے خالی وجود سے بھرا ہوا تھا۔

☆☆☆

میں نذیر کے پاس بیٹھا ہوا تھا جب اچانک نذیر نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''تمہیں پتا چلا؟''

''کیا.....؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اونچا مکان پھر سے آباد ہونے والا ہے۔''

''کون سا اونچا مکان؟'' میں نے پوچھا۔ گلی میں کئی گھر دو منزلہ بن چکے تھے۔

''کیا ہو گیا ہے تجھے؟'' نذیر ہنسا۔ ''جیسے جانتا نہیں یا مجھے الو بنا رہا ہے۔''

''کیا؟'' اچانک میرا دل دھڑکنے لگا۔

نذیر نے قہقہہ لگایا۔ ''آ گیا نا اپنی اصل پہ۔''

''کب آئے وہ لوگ؟'' میں نے پوچھا۔

''کل سے صفائی ہو رہی ہے مگر تیری کھڑکی ابھی نہیں کھلی۔'' وہ بولا۔

میں نے گردن گھما کے دیکھا۔ نذیر کی بیٹھک سے وہ کھڑکی آج بھی نظر آ رہی تھی۔ کھڑکی ہنوز بند تھی۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر گردن واپس گھمائی۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' میں نے گہری سانس بھری۔

''کیا پرانی محبت یاد آ رہی ہے؟''

''محبت کہاں یار۔'' میں نے پھر گہری سانس بھری۔ ''وہ تو بس ایک کسک، ایک ناسور ہے۔ ایسا گھاؤ کہ جب بھی بھرنے لگتا ہے، یادوں کے پنجوں سے کھرچ کھرچ کے سرخ کر لیتا ہوں۔''

''یار تو تو بڑی فلمی سی باتیں کرنے لگا ہے۔''

''یار! یہ جو محبت ہے نا، یہ لفظ سکھا دیتی ہے ورنہ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں آٹھویں پاس ہوں۔ نہ مجھے مطالعے کا شوق اور نہ ہی.....''

میں چپ ہو گیا۔ بات ادھوری رہ گئی۔ نذیر کی بیوی اندر داخل ہو رہی تھی۔

''میں کہتی ہوں کہ یہ تم نے کیا تماشا لگا رکھا ہے۔ تم باپ بیٹوں کا روز کا کوئی نیا فساد کھڑا ہوتا ہے۔'' نذیر کی بیوی نے ایک چبھتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی مگر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

''اب کیا نیا مسئلہ بنا لیا ہے اس نے؟'' نذیر نے ایک گہرا کش لے کر سگریٹ کا ٹوٹا نیچے پھینک کر جوتے سے مسلا۔

''کیا یہ سامنے ایش ٹرے نظر نہیں آ رہی جو نیچے گند ڈال رہے ہو؟'' اس نے نذیر کی حرکت پر ناگواری کا اظہار کیا۔

''گند؟'' نذیر نے تجاہل عارفانہ کا مظاہرہ کیا۔ ''میرے سامنے تو تم ہو۔''

''تم نہیں سدھرو گے۔'' دفعتاً وہ ہنس پڑی اور پھر میری طرف مڑ کے بولی۔ ''کبھی اس سازشی بڈھے کو بھی سمجھاؤ۔''

مجھے ہنسی آ گئی۔

مجھے معلوم تھا کہ اب ان کے درمیان وہی پرانا قصہ دہرایا جائے گا۔ جب وہ غصے میں ہوتی تھی تو نذیر کو سازشی بڈھے کا لقب دیتی تھی اور جب موڈ میں ہوتی تھی تو بھی اسے سازشی بڈھا کہتی۔

نذیر کی اور اس کی شادی کا سارا معاملہ ایک سازش

UUNOVELS.COM

تھا۔ نذیر میری طرح طبیعت کا خاموش نہیں بلکہ کھلا ڈلا آدمی تھا۔ اس کو اپنی ماموں زاد پسند تھی جو کہ ایک بیکری والے کی بیٹی تھی۔ بس کا باپ یعنی نذیر کا ماموں اس کباڑیے کی اولاد سے شادی کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔

''تو کیا ہوا ہم کباڑیے کی اولاد ہیں تو پرانی چیزیں بیچتے اور خریدتے ہیں مگر ہمارا کام کھلا اور بے ایمانی سے پاک ہے۔ تیرا باپ تو بھوسی ٹکڑوں کی ڈبل روٹی بنا کے بیچتا ہے۔ دودھ سڑ جائے تو دہی بنا دیتا ہے۔ کیا ہے تیرا باپ۔ معاشرے کا ناسور... بدبخت۔'' نذیر چلا کے کہتا۔ ''تو میرے ساتھ بھاگ چل۔''

''کہاں؟''

''جہاں کوئی نہ ہو۔'' نذیر نے فرمایا۔

''نکاح کون پڑھائے گا تیرا باپ یا یہ میسنا۔'' اس کی محبوبہ نے بیک وقت نذیر کے باپ اور مجھے رگیدا۔

''ہرگز نہیں۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''مجھے اس معاملے میں شامل مت کرو۔'' میں نے احتجاج کیا۔

وہ دونوں خاموش ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔

ان کے اس اچانک خاموش ہو جانے سے مجھے خطرے کا احساس ہونے لگا۔ ''کیا بات ہے، تم دونوں مجھے اس طرح کیوں گھور رہے ہو؟''

''تم ہی ہمیں ملا سکتے ہو۔'' نذیر نے میری طرف غور سے دیکھا۔

''یہ کیا کرے گا؟'' نذیر کی بات پر اس نے کہا۔

''میں.....'' میں نے گھبرا کے کہا۔ ''میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''تم پتھر مار کے بیکری کا شیشہ توڑ سکتے ہو۔ دھمکی دے سکتے ہو اور پتا ہے.....'' نذیر نے اچانک پراسرار انداز اختیار کر لیا۔

''تم مجھے ان لڑائی جھگڑوں سے دور رکھو اور پھر مجھے اس سے شادی تھوڑی کرنی ہے، یہ تو تم دونوں کا مسئلہ ہے۔'' میں نے فوراً بہانہ تراشا۔

''بس سب کچھ میرے ذہن میں آ گیا ہے۔'' اچانک نذیر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''ماموں ایک نمبر کا ڈرپوک ہے۔ بس ہمیں اسی سے فائدہ اٹھانا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ اپنے باپ کے اس طرح کے تذکرے پر جز بز ہوئی۔

''تم کل کہہ دینا کہ میں کالج نہیں جاؤں گی۔'' نذیر نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ تنک کے بولی۔ ''میں اپنی پڑھائی چھوڑ نہیں سکتی۔ ممکن ہی نہیں۔''

''سنا تو کر بندر کی بچی۔'' نذیر غصے سے بھنا کر بولا۔

''پہلے ہی ٹرٹر شروع کر دیتی ہے۔''

''بکو مت۔'' وہ غصے سے بولی۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تم کل کالج نہ جانا۔ ماموں پوچھیں تو کہہ دینا لیقے کے بندے میرا پیچھا کرتے ہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے اور بس۔ دو چار دن کالج نہ جانا۔''

''اس سے کیا ہوگا؟'' میں نے کہا۔ ''اور لیقے کا نام کیوں لے رہے ہو؟ تم کو معلوم ہے کہ لیقا کون ہے۔ سبزی منڈی کا نامی گرامی بدمعاش ہے۔ چار قتل کے مقدمے چل رہے ہیں اس پر۔'' میں نے نذیر کے منصوبے پر فوراً اعتراض کیا۔

''تو لیقے کو بتانے کون جائے گا؟ میں، تم یا..... یہ.....'' اس نے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔ ''ماموں ڈرپوک..... جس کی زبان میں تو دم ہے مگر دل تھی چڑیا سا ہے۔''

نذیر اپنے ماموں کی حقیقت جانتا تھا۔

''لیکن اس سے ہوگا کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں جانتا ہوں۔'' نذیر نے کہا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''اب تمہارا کام شروع ہوگا۔ تم نے پہلے دن پتھر مار کے شیشے توڑ دینے ہیں اور پھر دوسرے دن ایک خط ماموں کو ارسال کر دینا۔''

''کیا مطلب؟ کیا میں کوئی قربانی کا بکرا ہوں؟'' میں نے گھبرا کے کہا۔ ''اگر ماموں نے دیکھ لیا تو پھر..... نہیں یار..... یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔''

''تو کیسا یار ہے؟ یار کے لیے تو لوگ ہنستے مسکراتے پھانسی پر چڑھ جاتے ہیں۔''

''وہ اور یار ہوں گے۔'' میں نے صاف انکار کر دیا۔

''ارے سن تو لو۔'' اچانک رخشندہ نے لجاجت سے کہا۔ ''ایک ذرا سی نذیر کی بات ماننے سے کیا بگڑ جائے گا؟''

''اور کیا..... رات تین بجے کس کو پتا کہ کون بیکری کے شیشے توڑ گیا۔'' نذیر نے مجھے اور رخشندہ کو دیکھ کر فوراً کہا۔ ''بس تم نے پتھر کے بعد ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے اور بس۔''

''کیا اس کے بعد بھی کوئی کام ہوگا؟'' میں نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

''جب نیا شیشہ لگ جائے تو پھر ایک اور پتھر مار دینا۔'' نذیر نے اطمینان سے کہا۔

''اور اس نے پولیس میں رپورٹ کر دی تو؟'' میں نے پریشان ہو کے پوچھا۔

UUNOVELS.COM

''ماموں اور پولیس میں رپورٹ لکھوائیں گے، تھانے جائیں گے؟ ان کا تو تھانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے ہی دم نکلتا ہے۔''

رخشندہ نے باپ کے بارے میں اس قسم کی بات سن کر ناگواری کا اظہار کیا اور چائے کا کپ کھینچ کر نذیر کو مارا جو نذیر کے ماتھے پر لگا اور گومڑ نکل آیا۔

''شرم نہیں آتی مجھ پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔ اپنے مستقبل کے مجازی خدا پر۔'' نذیر نے چیخ کر کہا۔

''اور تمہیں غیرت نہیں آتی۔ اپنے اکلوتے ماموں کا اس طرح تذکرہ کرتے ہوئے..... بے حیا۔''

رخشندہ نے اپنے حملے کا جواز پیش کیا اور بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

نذیر ماتھا سہلاتے ہوئے ہنسنے لگا۔

☆☆☆

اور پھر وہی ہوا جو نذیر نے سوچا تھا۔

رخشندہ نے دوسرے دن کالج سے آکے اپنا بیگ بیڈ پر پھینکا اور چیخ چیخ کر رونے لگی۔ ماں سراسیمہ اس کے پاس آئی۔

رخشندہ نے کہا۔ ''آج مجھے لیبع کے غنڈوں نے چھیڑا ہے۔''

''کیا.....؟'' ماں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ''کب؟ کیسے؟ کس طرح؟'' اس نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔

''کل میرے ساتھ چلنا اور دیکھ لینا۔'' رخشندہ روتے ہوئے چلا کے بولی۔

''م..... میں کیوں جاؤں؟'' رخشندہ کی ماں نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ ''بس کل سے تمہارا کالج جانا بند۔''

اسی وقت گھر میں ہنگامی کانفرنس منعقد ہوئی۔ رخشندہ کے باپ سراج نے کہا۔ ''دیکھو بیٹی! اس کا کیا ہے وہ غنڈا ہے، قاتل ہے، دشمنوں کو چیونٹیوں کی طرح مسل دیتا ہے۔''

''تو کیا میں اس کے ڈر سے کالج چھوڑ دوں؟ کل کہیں گے کہ دنیا چھوڑ دو۔'' رخشندہ نے غصے سے کہا۔

''کیا واہی تباہی بک رہی ہو۔'' ماں نے اسے ڈانٹا۔

''میں ہی بری ہوں نا۔ سب کا مجھ ہی پر بس چلتا ہے۔'' رخشندہ نے رونا شروع کر دیا۔ رخشندہ کی ماں نے کلس کے کہا۔ ''میں تو کہتی ہوں کہ لڑکی کے ہاتھ پیلے کرو۔ اپنے شوہر کی ذمے داری بنے ہماری جان چھوڑے۔''

''رشتے ملتے کہاں ہیں؟'' رخشندہ کے باپ نے کہا۔

''اب تمہیں نظر نہیں آرہا تو میں کیا کروں۔ کب سے رشتہ مانگ رہی ہے نذیر کی ماں۔''

''وہ منحوس، صورت حرام۔'' رخشندہ کے باپ نے غصے سے کہا۔ ''میں مر جاؤں گا مگر اس کباڑیے کی اولاد کو اپنی بیٹی نہ دوں گا۔ منحوس سارا دن کچرے میں گھسا رہتا ہے۔ عید بقرعید کوئی دن ہے جو اس نے کباڑ خانے سے باہر گزارا ہو؟''

''تم جانو تمہارا کام۔'' رخشندہ کی ماں نے تنک کے کہا۔ ''کل کلاں کو کچھ ہو گیا تو سر پر ہاتھ رکھ کے رونا۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔'' رخشندہ کے باپ نے کہا اور پیر پٹختا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

دوسرے دن رخشندہ کالج نہیں گئی۔

☆☆☆

رات کو تین بجے کے قریب میں نے ایک زوردار پتھر بیکری کے شیشے پر دے مارا جہاں بلب کی روشنی میں ڈبل روٹی، کیک اور پیسٹریاں چمک رہی تھیں۔

شیشہ ایک زوردار چھناکے سے اندر جا کے گرا اور کرچی کرچی ہو گیا۔ رخشندہ کے باپ نے کچھ ہی دن پہلے یہ شیشہ لگوایا تھا۔

شیشہ توڑ کر میں نے جا کر رخشندہ کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سب ہی کو معلوم تھا کہ میں رات میں منڈی کے لیے نکلتا تھا لہٰذا اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔

دروازہ رخشندہ کے بھائی نے کھولا۔ اس کی آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں اور چہرہ غصے سے بھرا ہوا۔ واضح طور پر وہ میری زوردار دستکوں کے باعث گہری نیند سے بیدار ہوا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے مجھے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

''تمہارے ابا کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ سو رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اتنی رات میں کیا مسئلہ ہو گیا تمہیں؟''

''مسئلہ مجھے نہیں تمہیں ہوا ہے۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''تم لوگ نیند میں مزے اڑا رہے ہو اور تمہاری بیکری کے کسی نے شیشے توڑ دیے ہیں۔''

''کیا؟'' اس کی نیند ہوا ہو گئی۔

''ابا.....'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''بیکری میں ڈاکا پڑ گیا ہے، جلدی اٹھو۔''

ذرا کی ذرا میں پورا گھر اٹھ بیٹھا۔ رخشندہ کے دونوں بھائی رخشندہ اور اس کا باپ دروازے میں جمع ہو گئے۔

''کس نے ڈاکا ڈالا؟'' رخشندہ کے باپ نے کہا اور مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔

''مجھے کیا پتا۔ میں نے تو بیکری کا شیشہ ٹوٹا ہوا دیکھا تو

UUNOVELS.COM

بتا دیا۔"

میں نے دیکھا کہ رخشندہ نے عقب سے اپنی ماں کے کان میں کوئی سرگوشی کی تھی۔ رخشندہ کی ماں نے میاں سے کہا۔

"ارے وہی ہوں گے لفنگے بدمعاش قسم کے ساتھی۔ بیکری لوٹ کر لے گئے۔"

مجھے ہنسی آنے لگی تھی مگر میں نے بڑی مشکل سے ضبط کی۔

رخشندہ کی ماں کے انکشاف نے رخشندہ کے باپ کا چہرہ زرد کر دیا۔

"ہونہہ ہو، انہی کی کارروائی ہے۔" رخشندہ کی ماں نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ "آج کالج نہیں بھیجا تو انہوں نے یہ انتقامی کارروائی کر ڈالی۔ میں تو کہتی ہوں کہ یہ محلہ چھوڑ کے ہم نواب شاہ چلتے ہیں۔"

"پاگل ہوگئی ہو کیا۔" رخشندہ کے ابا نے درمیان میں ایک ناقابلِ اشاعت گالی فٹ کی۔

میں نے کہا۔ "سارا قصہ یہیں کھڑے کھڑے نمٹاؤ گے یا بیکری کی بھی خبر لو گے۔"

"چلو....." رخشندہ کا بڑا بھائی کمبل لپیٹے باہر نکلا۔

"دیکھتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے؟"

رخشندہ کے ابا غصے میں تھے اور ڈر بھی رہے تھے۔

مجھے ان کی اس حالت کو پہلی مرتبہ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ جس وقت نذیر نے کہا تھا کہ ماموں تو ڈرپوک ہیں، اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ واقعتاً اتنے چھوٹے دل کے ہیں۔

"تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔" رخشندہ کے باپ نے میرا بازو پکڑا۔

"میں کیا کروں گا جا کے..... یہ تو تم لوگوں کا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے دیکھا تو آ کے بتا دیا۔ محلے داری کا حق تھا ادا کر دیا۔"

"تم نذیر کے دوست ہو نا۔" رخشندہ کے بڑے بھائی نے کہا۔ "وہ ہمارا ماموں زاد ہے، بھائی ہے تو تم بھی ہمارے بھائی ہوئے۔ ذرا دیر میں چلے جانا۔" اس کا سانولا چہرہ مزید سانولا ہو گیا تھا۔

مجھے ہنسی تو بہت آئی۔ یہ وہی تھا جو کہ ہمیشہ ہماری ٹوہ میں لگا رہتا تھا اور اس نے کبھی بھی ہم سے ایک محلے میں رہتے ہوئے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی۔ بیکری کی وجہ سے اس کا رویہ دوسروں سے بڑی ہنک والا ہوتا تھا۔

میں دل ہی دل میں خوب مزے لے رہا تھا۔ ہم بیکری تک پہنچے تو ایک بلی اور ایک کتا اندر موجود تھے۔

رخشندہ کے باپ نے پھر زیرِ لب ایک ناقابلِ اشاعت گالی کا اجرا فرماتے ہوئے تالا کھولا اور اندر کی لائٹیں جلائیں۔

سامنے ہی وہ بڑا سا پتھر پڑا ہوا تھا جس سے میں نے شیشہ توڑا تھا اور قریب ہی ایک کاغذ پڑا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" رخشندہ کے چھوٹے بھائی نے وہ کاغذ اٹھایا اور بلب کی روشنی میں اس کو کھولا۔

اس پر نیڑھے میڑھے لفظوں میں لکھا تھا..... "کب تک اندر رکھو گے؟ ہم اٹھا کے لے جائیں گے۔" تحریر سے لگ رہا تھا جیسے کسی بچے کی لکھائی ہے۔

"یہ..... یہ کیا ہے ابا؟" رخشندہ کے بڑے بھائی نے سوال کیا۔

مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ مزید کہتا، دھپ کی آواز آئی تو ہم سب نے چونک کر دیکھا۔ رخشندہ کا باپ گھبرا کے فرش پر گر کے بے ہوش ہو گیا تھا۔

اس کارروائی کا نتیجہ آئندہ دو دن میں سامنے آ گیا۔

جب نذیر کا نکاح رخشندہ سے فقط شربت کے گلاس پر ہو گیا اور بیکری میں شیشوں کی جگہ پہلے کی طرح شٹر لگ گئے۔

یہ تھی وہ سازش جس کی وجہ سے رخشندہ ہم دونوں کو سازشی کہتی تھی۔ حالانکہ اس سازش کو اندرونِ خانہ ہوا دینے میں وہ پوری کی پوری شامل تھی۔ مگر اس سب کے باوجود اس کو کھڑکی والے معاملے کی ہوا تک نہیں لگی تھی۔

بقول نذیر کے..... "یار تیرے معاملے کو میں کیسے کسی کو بتا سکتا ہوں۔ تو تو دوست ہے۔ تیری ہر بات امانت ہے۔"

☆☆☆

ایک بار پھر میری راتوں کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ میں نے آہستگی سے زلیخا کی طرف دیکھا، وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

میں دھیمے سے بنا آواز پیدا کیے اٹھا اور اپنی الماری کو آہستہ سے کھولا۔ سب سے نچلے حصے میں وہ ڈبا رکھا ہوا تھا جس سے میری تنہائیاں آباد تھیں۔ وہی ڈبا جو مجھے زبیدہ، میری زوجہ مجھے تحفے میں دے گئی تھی جس میں سمسن..... ڈیلائیلا کی کہانی اور اس کی چوٹی رکھی ہوئی تھی۔ وہی چوٹی جس کی خوشبو آج بھی برقرار تھی۔

میں نے احتیاط سے کپڑا ہٹایا اور ڈبا کھولا۔ کتاب بھی ویسے ہی رکھی تھی اور اس پر رکھی ہوئی چوٹی کی رنگت بھی ویسی ہی تھی جیسے برسوں پہلے تھی۔ یوں جیسے اس پر وقت ٹھہرا ہوا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ یادیں مر کیوں نہیں جاتیں؟ بوڑھی ہو کر ذہن سے اتر کیوں نہیں جاتی ہیں؟

میں نے دھیمے سے، بہت آہستگی سے اس چوٹی کو

اپنی انگلیوں سے چھوا۔ آنکھیں بند کر کے بولا۔ ''تمہارے بال کتنے خوبصورت ہیں۔''

زوبی ہنسی۔ ''یہ جملہ تم ہزاروں بار کہہ چکے ہو۔''

''اور کیا کہوں؟'' میں نے جذب کے عالم میں کہا۔

''تم نے مجھے جاتے ہوئے لفظ دیے کہاں؟''

''تو تم بولتے..... کچھ کہتے؟'' اس کی آواز میں ویسی ہی نرمی تھی۔

''کچھ کہوں گا تو تم پھر وہی کرو گی۔'' میں نے کہا۔

''کیا کروں گی؟'' وہ شوخی سے بولی۔

''اپنا منہ چھپا کے دروازے کو کھلا چھوڑ کر بھاگ جاؤ گی۔''

وہ ہنسنے لگی پھر اسی طرح منہ چھپا کے اندر بھاگ گئی۔ میں اس دن کی طرح ابھی تک دروازے میں کھڑا تھا۔

اچانک زلیخا نے نیند میں کروٹ لی اور میرے تکیے کو اپنے قریب کھینچا اور اس پر ہاتھ رکھ کر پھر سو گئی۔

میں نے آہستہ سے ڈبا بند کیا۔ الماری کے نچلے خانے میں رکھا اور الماری کا پٹ دھیرے سے بند کر کے اپنے بیڈ پر آ گیا اور سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر چھت کو گھورنے لگا۔

پتا نہیں یہ کیسا چور ہے جو دل میں گھس کے، بکل مار کے بیٹھ جائے تو نکلنے کا نام تک نہیں لیتا۔ کیوں انسان اتنا بے بس اور بزدل ہے کہ اپنے ہی اندر چھپے چور کو باہر نکال نہیں پاتا۔

بہت سارے سوالات دماغ کے گنبد میں چکرانے لگے۔ بہت سارے سوال سوالی بن کے دل کے دروازے کے باہر لائن لگا کے بیٹھ گئے۔

کاش ہم اپنے اپنے چور کو نکال سکتے اور پوچھ سکتے کہ کیا کرتے رہتے ہو..... ہمیشہ کیوں بے چین کرتے ہو ہم کو؟

مگر کوئی جواب کہیں سے نہیں ملتا۔ جلتی آنکھیں چھت کو گھورتے گھورتے موند جاتی ہیں۔ ایسے میں بس ایک ہی دیوی ہے جو شانتی دیتی ہے، تسلی دیتی ہے اور اپنی نرم دبیز ریشمی تھپتھپاہٹ سے آنکھیں بند کر دیتی ہے۔ دماغ کو معطل کر دیتی ہے، حسیات کو سن کر دیتی ہے۔

مہربان دیوی..... نیند کی دیوی.....

☆☆☆

برسوں کی عادت تھی۔ رات چاہے کتنی ہی دیر میں سونے کے لیے لیٹوں، آنکھ اپنے وقت پر تین ساڑھے تین بجے کھل جاتی تھی۔ میرے اٹھتے ہی جیسے کسی لاشعوری دستک سے زلیخا بھی بیدار ہو جاتی تھی۔ میرے لیے ناشتا بناتی۔ چائے تیار کرتی اور مجھے بالکل اسی طرح رخصت کرتی جیسے ابا کو اماں رخصت کرتی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اماں ساتھ ساتھ باتیں کرتی جاتی تھیں اور زلیخا چپ چاپ کام کیے جاتی۔ بس اس کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ بولتی رہتی تھی۔ میں یہاں ہوں۔ میں یہ کر رہی ہوں۔ بس ناشتا لا رہی ہوں۔

میں حسب معمول گھر سے نکلا۔ گلی نیم اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ زبیدہ کے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا، زبیدہ کا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں ہمیشہ کی طرح اسے دیکھتا ہوا گزر گیا۔ شاید وہ لوگ ابھی تک منتقل نہیں ہوئے تھے۔

منڈی میں خاصی تیزی تھی۔ ہماری ملکی پیاز کی فصل کچھ خراب ہو گئی تھی اور کچھ بیرون ملک بھیجے جانے کے سبب پیاز کی قلت تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ ایسا ہوگا۔ میرا برسوں کا تجربہ کچھ معاملات کی بو پہلے ہی سونگھ لیتا تھا۔

جو پیاز مہینے بھر پہلے دکاندار تیس روپے کلو بیچ رہے تھے، اب وہ منڈی میں آڑھت کے ریٹ تھے اور باہر پیاز اسی سے ایک سو دس روپے کلو کے درمیان بک رہی تھی۔ میرے پاس پیاز کی اچھی خاصی مقدار تھی۔ میرے گودام میں چار پانچ ہزار بوریاں موجود تھیں۔

میں منڈی پہنچا تو معلوم ہوا کہ ہندوستان سے پندرہ دنوں میں پیاز کی سپلائی بحال ہونے والی ہے جس کے نتیجے میں پیاز کی قیمت گرے گی۔

''دو ہزار بوریاں آج لازمی نکال دو۔'' میں نے اسلم سے کہا۔

''مگر ابھی تو نئی فصل آنے میں دو مہینے ہیں۔'' شبیر آڑھتی نے تعجب سے پوچھا۔

''گودام میں جگہ بھی تو چاہیے۔'' میں نے شبیر آڑھتی کو جواب دیا۔ وہ چپ ہو گیا۔

بارہ روپے کی خرید پیاز چالیس میں نکلے تو پھر منافع کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔ مسئلہ صرف کاروباری سوجھ بوجھ کا ہوتا ہے۔

میں نے چائے منگوائی اور بن کے ساتھ پینے لگا۔

صبح کے نو بج رہے تھے۔ میں پیسے لے کر گھر نہیں جاتا تھا۔ منڈی میں بنے ہی بینک میں جمع کرا دیتا تھا۔ بعض اوقات لاکھوں روپے ہوتے تھے۔ حالات ایسے نہیں تھے کہ نقدی لے کر سفر کیا جائے، چاہے وہ سفر کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔

میں نے کچھ سبزیاں وغیرہ لیں اور گھر روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچ کر میں نے سبزیاں رکھیں اور ہاتھ منہ دھو کر جو بستر پر لیٹا تو بے خبر سو گیا۔

UUNOVELS.COM

میری آنکھ کھلی تو زلیخا ریحان سے کہہ رہی تھی۔ ''جاؤ وہاں سبزی دے کر آؤ۔''

''جی امی .....'' ریحان نے کہا اور سبزی اٹھا کے باہر نکل گیا۔

زلیخا بھی اماں کی طرح سبزیاں آس پاس کے گھروں میں بھجوادیا کرتی تھی۔

میں نے بستر پر لیٹے لیٹے پکار کے کہا۔ ''نذیر کے ہاں بھی بھجوا دیتا۔''

''لو بھلا، یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔'' زلیخا دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

''بھئی کمال ہے کہ تم سب یاد رکھتی ہو۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''پہلے چائے لاؤں یا پھر کھانا؟''

''نہیں، پہلے چائے لے آؤ۔'' میں نے بازو پھیلا کے انگڑائی لی۔ ''صبح کا آغاز تمہارے ہاتھ کی چائے سے کروں تو دن اچھا گزرتا ہے۔''

''صبح .....'' زلیخا نے کہا۔ ''ذرا گھڑی دیکھیں، تین بج رہے ہیں۔''

''مگر ہماری تو اب صبح ہوتی ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''لگتا ہے آج کی آڑھت بہت اچھی ہوئی ہے جو آپ کا مزاج اچھا ہے۔''

''تو میں تم سے لڑتا کب ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں تو .....'' وہ جیسے پھر اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

''میرے کہنے کا یہ مطلب تو نہیں تھا۔'' وہ دھیرے سے بولی اور کمرے سے نکل گئی۔

دفعتاً مجھے یاد آیا کہ نذیر سے مل کر پوچھوں کہ کیا وہ لوگ آگئے؟ نذیر کا زیادہ تر وقت تو بیٹھک میں ہی گزرتا تھا۔

میں اٹھا اور غسل خانے میں چلا گیا۔ نہا کر نکلا تو مٹر قیمہ اور گرم گرم روٹیاں تیار تھیں۔ کھانے کی خوشبو ایسی تھی کہ میری بھوک چمک گئی حالانکہ تھوڑی دیر پہلے میرا کھانے کا ارادہ نہیں تھا۔

میں نے کھانا ختم ہی کیا تھا کہ زلیخا چائے لے کر اندر داخل ہوئی۔ خالی پلیٹیں دیکھ کے بولی۔ ''مجھے معلوم تھا کہ آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی اس لیے میں جلدی سے گرم گرم روٹیاں اتار لائی۔''

میں نے سر ہلایا۔ اس نے چائے سائڈ ٹیبل پر رکھی اور پوچھا۔

''آپ کہیں جا رہے ہیں کیا؟''

''میں کہاں جاؤں گا۔ بس ذرا دیر کو نذیر کی بیٹھک میں جاؤں گا۔''

''آپ کے دوست نہیں بدلتے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں بھلا دوست بھی بدلنے کی چیز ہوتے ہیں کیا۔ ویسے بھی نذیر میرا بچپن کا دوست ہے بس اس سے دل مل گیا ہے۔''

''صحیح کہتے ہیں آپ۔ جب دل مل جائے تو پھر دوسرے کی گنجائش کہاں ہوتی ہے؟'' اس نے بڑے دھیمے لہجے میں کہا۔ میں خاموش رہا۔

اب بھلا اس کی بات کا میں کیا جواب دیتا۔ سچ بھی یہی تھا کہ نذیر کے علاوہ میرا کوئی دوست تھا بھی نہیں۔ باقی محلے میں سلام دعا تو سب سے تھی لیکن میرا اٹھنا بیٹھنا نذیر کے ساتھ ہی تھا۔

میں چائے پی کر نذیر کی طرف چل دیا۔ وہ حسبِ معمول بیٹھک میں ہی تھا۔ وہ اپنا کباڑی کا کام بارہ بجے تک نمٹا لیتا تھا۔ ویسے بھی اس کے دو شاگرد سارا دن وہاں ہوتے تھے۔

مجھے دیکھ کر وہ ہنسا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔

''اب اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تجھے ہی یاد کر رہا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''میرا دل کہہ رہا تھا کہ تم آؤ گے۔''

''دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔''

''نہیں، جہاں چاہ وہاں راہ ہوتی ہے۔'' وہ بولا۔

''آج بھی گھر میں صفائی کا کام ہو رہا ہے۔ ایک بہت بوڑھی سی کلومائی اندر باہر آتی جاتی ہے۔ باقی تو کوئی نظر نہیں آیا۔'' نذیر نے رپورٹ دی۔

''میں نے تو کچھ پوچھا ہی نہیں۔''

''اچھا .....'' نذیر نے حیرت سے کہا۔ ''چلو تم نے پوچھا ہی نہیں، میں نے بتایا ہی نہیں اور آگے بھی نہیں بتاؤں گا کیونکہ بھلا تمہیں کیا دلچسپی۔'' وہ بولا اور پھر ہنسنے لگا۔

میں خجل سا ہو گیا۔ نذیر نے غور سے میرا چہرہ دیکھا اور کہنے لگا۔

''یار! تُو ذرا بھی نہیں بدلا۔ ساٹھ برس کا ہو رہا ہے اور آج بھی اس کے ذکر سے تیرے گالوں پر لالی دوڑ جاتی ہے۔ عجیب مرد ہے تو۔'' اس نے کہا پھر ذرا ٹھہر کے بولا۔

''نہیں یار! آج کے تناظر میں جملہ درست کر لوں۔ عجیب بڈھا ہے تو .....'' وہ پھر ہنسنے لگا۔

مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''مجھ سے زیادہ

بڈھے تو تم ہو۔ مجھ سے دو چار سال بڑے ہو۔ میں تو ستاون کا ہوں، تم باسٹھ برس کے سٹھیائے ہوئے بڈھے۔'' میں نے کہا اور پھر خاموش ہو گیا۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ہنسنے لگے۔

''یار! جب میں چھوٹا تھا تو ابا سے کہتا تھا کہ ابا تم اتنے برسوں سے ایک جگہ رہ رہ کے تھک نہیں جاتے، اکتا نہیں جاتے۔ تب وہ بڑے پیار سے کہتے تھے..... نذیرے بیٹا جب تو ہماری عمر کو پہنچے گا تو تجھے پتا بھی نہیں چلے گا بچوں کی دیکھ بھال میں، پالنے پوسنے میں وقت کیسے دن رات کو گلا دیتا ہے۔ جیسے میرے ماہ و سال گزر گئے۔ ویسے ایک دن تم بھی سوچو گے ہائے..... اتنا وقت کیسے گزر گیا۔''

''سچ کہتے تھے چاچا جی.....'' میں نے کہا۔ ''میں بھی آج سوچتا ہوں کہ ابھی کل ہی کی بات تھی۔ میں ابا کے ساتھ منہ اندھیرے موٹر سائیکل پر سبزی منڈی جاتا تھا اور اب دیکھو، راستے وہی رہے مگر ہم دن رات کی ریس میں پس گئے۔''

''ہاں یار.....'' نذیر نے میرے گھٹنے پر ہاتھ مارا۔ ''بس ایک چیز نہیں بدلی۔ رخشندہ مجھے آج بھی پہلے جیسے دکھتی ہے۔ ویسے ہی شوخ، شریر، چلبلی، جملے باز۔''

''کتنے خوش قسمت ہو کہ کہیں وہ مل گئی جس کو تم نے چاہا۔''

''یار! زلیخا بھابی بھی بہت اچھی ہے۔'' نذیر نے کہا۔

''ہاں، اس میں کیا شک۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن نہ ملنے کی کسک اور تڑپ شاید تعلق کو مضبوط کر جاتی ہے۔ نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی تسلی۔ نہ قول نہ قرار..... بس دل کے سادے کاغذ پر اپنا نام ایسا لکھ گئی کہ مٹانا چاہوں تو بھی نہیں مٹ سکتا۔''

اچانک کسی نے بیٹھک کے پٹ کو تھپتھپایا۔

میں نے اور نذیر نے چونک کر بیک وقت دیکھا۔ وہاں ایک گہری سانولی رنگت کی عورت کھڑی ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں وہاں سے آئی ہوں۔'' اس نے انگلی کے اشارے سے کھڑکی والے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

''اچھا.....'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا۔ ''کیا بات ہے؟''

''وہ گھر کی بتی جلتے جلتے اچانک بند ہو گئی ہے۔ گھر پر کوئی نہیں ہے۔ اکیلا گھر ہے۔ کوئی لڑکا ہے تو بھیج دو۔ ذرا بلب دیکھ لے، فیوز تو نہیں ہو گیا۔ یا کسی دکان سے بجلی والے کو بلا دیں، مجھے یہاں دکانوں کا پتا نہیں۔''

''جاؤ تم دیکھ لو۔'' نذیر نے مجھ سے کہا۔ ''میرے گھٹنوں میں تو درد ہے۔''

''چلو.....'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ میرے آگے آگے چل پڑی۔

میں اس کے پیچھے پیچھے گھر جا پہنچا۔ برسوں بعد، شاید صدیوں کے بعد میں نے اس کھلے دروازے میں قدم رکھا جس کو ایک بار اپنے ہاتھوں سے بند کر کے گیا تھا۔

بیرونی دروازے کے ساتھ ہی چھوٹی سی ڈیوڑھی بنی ہوئی تھی جس میں بجلی کا میٹر لگا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی سرکٹ بریکر لگے تھے۔ میں نے قریب جا کے دیکھا۔ ایک بریکر آف ہو گیا تھا۔

میں نے اس کو آن کر دیا۔ ڈیوڑھی میں لگا ہوا بلب بھی روشن ہو گیا۔

''بھئی تم تو بڑے کاریگر ہو.....'' اس نے کہا۔ ''ذرا اندر کے بلب بھی چیک کر لو۔ سب جلتے ہیں یا نہیں۔ بجلی والے لگا تو گئے تھے اور ہاں، فریج کا تار بھی لگا دو۔ مجھے بجلی سے ڈر لگتا ہے۔ وہ لوگ تو کل آئیں گے۔'' بڑی بی بہت باتونی تھیں۔ بولے ہی جا رہی تھیں۔

اندر صحن کے ایک طرف سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں جس کے ساتھ وہ کمرا تھا جس میں کھڑکی باہر کھلتی تھی۔ نیچے تین کمرے تھے جن میں کافی سارا سامان بندھا ہوا رکھا تھا۔ ایک بڑا سا جہازی سائز فریزر بھی رکھا ہوا تھا۔

''اسی کو آن کرنا ہے.....؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں.....'' بڑی بی نے کہا۔

پلگ فریزر کے اوپر ہی پڑا ہوا تھا۔ میں نے فریزر کے پیچھے لگے ساکٹ میں پلگ لگا دیا۔ فریزر کی موٹر ایک جھرجھری لے کر بیدار ہو گئی اور موٹر چلنے کی باریک سی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

''اور تو کوئی کام نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں شکریہ۔'' اس نے کہا۔ ''کیا تم بجلی والے ہو؟''

''نہیں.....'' میں نے جواب دیا اور پوچھا۔ ''کیا تم یہاں اکیلی رہتی ہو؟''

''تم کہاں رہتے ہو؟'' اس نے فوراً سوال کیا۔ اس کا انداز ایک دم چوکنا ہو گیا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

''گھبراؤ نہیں۔ میں اسی گلی میں رہتا ہوں۔ جس بیٹھک سے مجھے بلا کے لائی ہو، اسی بیٹھک سے چار گھر آگے۔ میرا آڑھت کا کام ہے۔''

UUNOVELS.COM

"آڑھت ...... کا ہے کی آڑھت؟" بڑی بی کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"میرا منڈی میں سبزیوں کا کام ہے۔ میں سبزیاں خریدتا بیچتا ہوں۔" میں نے آسان لفظوں میں بڑی بی کو بتایا۔

"اچھا ...... اچھا ......" اس نے سر ہلایا۔ اس کے لہجے سے اطمینان کا اظہار ہونے لگا۔

"اگر کچھ کھانا ہے تو میں بھجوا دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "گھر میں کوئی نہیں ہے۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"ہاں گھر والے تو کل آئیں گے، میر پور خاص سے۔ تب ہی چولہا ہانڈی شروع ہوگا۔ دو دن سے اچار سے روٹی کھا رہی ہوں۔ تندور کی روٹی باسی اور سخت ہو گئی ہے۔" بڑی بی نے کہا۔

"فکر نہ کرو، کھانا اور چائے سب آ جائے گا۔" میں نے تسلی دی۔

"یہ محلے والے بڑے اچھے ہیں۔" بڑی بی نے کہا۔ "تھوڑی دیر پہلے ایک لڑکا بہت ساری سبزیاں دے گیا تھا۔ آلو، پیاز، ادرک، لہسن، دھنیا، مرچی اور بہت سارے مٹر۔"

"وہ میرا بیٹا تھا۔" میں نے بتایا۔

"اچھا ......" بڑی بی نے کہا۔ "یہ تو بڑا اچھا محلہ ہے، سب ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ تمہارا بہت شکریہ مگر یہ سب تو تب ہی استعمال ہوگا جب وہ لوگ آ جائیں گے۔"

"فکر مت کریں، اس میں کوئی چیز خراب ہونے والی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "ویسے آپ لوگوں نے یہ مکان خرید لیا ہے یا کرائے پر آئے ہیں؟"

"نہیں بھیا۔" بڑی بی کے لہجے میں اپنایت آ گئی۔ "یہ تو سمجھو ہمارا ہی ہے۔ برسوں خالی پڑا رہا۔ جب کسی پر وقت پڑا تو سہارا اسی مکان نے دیا۔ بس قسمت زدوں کی پناہ گاہ ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"پہلے حمیرا پر آفت پڑی تو اس گھر میں رہنے کو چلی آئی۔ پھر اس کی لڑکی پر مصیبت پڑی تو اب وہ آ رہی ہے رہنے کو۔"

"حمیرا ......" مجھے یہ نام سنا سنا سا لگا۔ "یہ حمیرا کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ارے برسوں پہلے رہنے کو آئی تھی یہاں چند دن کے لیے۔ اس کے میاں کے بھائیوں کے درمیان فساد ہو گیا تھا جائیداد کا۔ تینوں بھائیوں نے بیوی بچی سمیت گھر سے نکال دیا۔ تب حمیرا کے بھائی افضل نے اپنا یہ مکان بہن کو دیا تھا رہنے کو مگر پھر رشتے دار بیچ میں پڑے اور صلح صفائی کے بعد حمیرا اور اس کے میاں کو لے گئے آ کر......" بڑی بی نے بتایا۔

"ہاں ......" میں نے جواب دیا" مجھے یاد آ گیا۔ اس وقت شاید میں سولہ سترہ برس کا تھا۔ جب چند دنوں کے لیے ایک خاتون اپنی بیٹی کے ساتھ یہاں آئی تھیں۔"

"ہاں ...... ہاں ......" بڑی بی نے جلدی سے کہا۔ "تم نے صحیح پہچانا۔ حمیرا آئی تھی اپنی لڑکی کے ساتھ۔ کیا نام ہے، زبیدہ کے ساتھ۔"

"تو اب کون آ رہا ہے یہاں رہنے......؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"ارے آنا کس نے ہے۔ زبیدہ ہی آ رہی ہے۔ بہت تکلیف میں زندگی گزاری ہے اس نے۔ پتا نہیں دونوں ماں بیٹیوں کی قسمت کیسی ہے؟" بڑی بی نے کہا۔ ان کے لہجے میں بڑا تاسف تھا جیسے انہیں ان لوگوں سے دلی ہمدردی ہو۔

"آپ کی وہ کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ارے بھیا ......" بڑی بی نے ایک گہری سانس لی۔ "اللہ بخشے زبیدہ کے باپ کو۔ مجھ بے سہارا کو ایک بار جو بہن کہہ دیا تو پھر اس بیوہ سے ساری عمر بہن کا رشتہ نبھایا۔ میں ان دونوں کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ میرا کلیجا ہیں دونوں۔ اب جب سارا زمانہ ان کا دشمن ہوا ہے تو کیا میں اسے چھوڑ دوں؟ نہ بھیا نہ...... ایسی نمک حرام تو میں ہوں نہیں۔" انہوں نے کہا۔

میں خاموشی سے سنتا رہا۔ اسی وقت مغرب کی اذان ہونے لگی۔

"میں ذرا نماز پڑھ لوں۔" بڑی بی نے کہا۔

"مجھے بھی اجازت دیں۔ میں کھانا بھجواتا ہوں تھوڑی دیر میں۔" میں نے کہا اور اندر کے دروازے سے باہر آ گیا۔

☆☆☆

میں گھر واپس آ رہا تھا تو نذیر کی بیٹھک بند تھی۔ شاید وہ کسی کام سے اندر تھا۔ میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا گھر آ گیا۔ حسب معمول تحریم اپنی ماں کے ساتھ باورچی خانے میں مصروف تھی۔ میں نے تحریم کو آواز دے کے بلایا۔

"جی ابو......" وہ سر پر دوپٹا ڈالتی ہوئی اندر آ گئی۔ ان دنوں وہ رہنے کے لیے اپنی ماں کے پاس آئی ہوئی تھی۔

"بیٹا! امی سے کہنا کہ جہاں انہوں نے دن میں

UUNOVELS.COM

سبزیاں بھجوائی تھیں، وہاں ایک اماں ٹھہری ہوئی تھیں، ان کے لیے کھانا اور چائے وغیرہ بھجوا دیں۔ وہ گھر میں اکیلی تھیں۔"

"جی ابو......" تحریم نے سعادت مندی سے جواب دیا اور باہر نکل گئی۔ اچانک مجھے یاد آیا۔ میں گھر سے باہر نکلا اور بیکری سے چاکلیٹس اور آئس کریم لے آیا۔ مجھے بمشکل آنے جانے میں آدھا گھنٹا لگا ہوگا۔ میں نے گھر میں داخل ہو کر اوپری خانے کا رخ کیا۔ تحریم اپنی ماں سے باتیں کرتی ہوئی روٹیاں ڈال رہی تھی۔

"ابو چار دن کے لیے گھر آئی ہے اور تم اس سے روٹیاں بنوا رہی ہو۔" میں نے زلیخا سے کہا۔

"ابو جی! کام کرنا اچھا لگتا ہے مجھے گھر کا۔" تحریم نے ہنس کر کہا۔

"کیا لے آئے؟" زلیخا نے پوچھا۔

"یہ تحریم کے لیے ہے۔ چاکلیٹس اور آئس کریم۔" میں نے تحریم کو شاپر دیتے ہوئے کہا۔

"تم کسی چیز کی فکر مت کرنا بیٹی، نہ گھبرانا۔ تم اس گھر سے کبھی ضرور ہو بیاہ کے مگر یہ گھر، اس کا حصہ تم آج بھی ہو اور ہمیشہ رہو گی۔"

"جی ابو! میں جانتی ہوں۔" تحریم مسکرا دی۔

اپنی بیٹی کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ دیکھ کے میرا ڈھیروں خون بڑھ گیا۔ سچ ہی تو کہتے ہیں لوگ کہ بیٹی سے ڈر نہیں لگتا۔ ڈر اس کے نصیب سے لگتا ہے۔

مگر یہ ڈر جب بڑھ جاتا ہے اور ڈر سے بڑھ کے زخم میں ڈھل جاتا ہے جب آپ بے پروا ہو جاتے ہیں۔ بیٹی سے بے فکر ہو جاتے ہیں۔ جب تک آپ بیٹی کی فکر میں رہیں گے، اس کے معاملات میں شامل رہیں گے...... بیٹی کے سسرال والے اپنے رویے میں محتاط رہیں گے۔ میں سوچتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔

میں بستر پر لیٹا ہوا سوچ رہا تھا۔ زبیدہ اب کیسی ہو گی؟ کیا اس نے مجھے یاد رکھا ہوگا؟ کیا میں جیسے اس کو سوچتا ہوں وہ بھی مجھے سوچتی ہو گی؟ یا پھر میں اس کے لیے ایک گیا گزرا وقت بن کر رہ گیا ہوں؟

"ایسی کوئی بات نہیں۔" زبیدہ نے کہا۔

"ارے تم......" مجھے حیرت ہوئی۔

"اگر تم مجھے سوچو گے تو میں تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں؟"

"سچ!"

وہ ہنسنے لگی۔ اچانک جیسے کمرے میں اس کی آواز کے ساتھ روشنی پھیل گئی۔ میرے پپوٹوں پر دباؤ پڑا اور میں نے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

پاکستان

میں کچھ عرصے سے

مختلف مقامات سے یہ شکایت موصول ہو رہی ہیں کہ ڈائجسٹ تاخیر کی صورت میں قارئین کو اسٹال پہ نہیں ملتا۔ اس سلسلے میں ادارے کے پاس دو تجاویز ہیں۔

آپ اپنے قریبی دکان دار کو ایڈوانس

100 روپے

ادا کر کے اپنا پرچا بک کروالیں۔

یا

ادارے کو 1200 روپے بھیج کر سالانہ خریدار اور 600 روپے ادا کر کے 6 ماہ کے لیے بھی خریدار بن سکتے ہیں اور گھر بیٹھے پورے سال اپنے پسندیدہ ڈائجسٹ وصول کر سکتے ہیں

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

آنکھیں کھول دیں۔

زبیدہ نہیں، زلیخا سامنے کھڑی تھی اور بجلی کے بورڈ کے پاس کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' مجھے دفعتاً ناگواری کا احساس لگنے لگا۔

''اندھیرے کمرے میں لیٹے ہیں، کھانا بھی نہیں کھایا۔ تیار ہے، لے آؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں رہنے دو۔ دل نہیں چاہ رہا۔'' میں نے جواب دیا۔

''خیریت..... طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟'' وہ میرے بستر کی طرف بڑھ آئی۔

''طبیعت ٹھیک ہے، بس ذرا بتی بجھا دو۔ سر میں درد ہے۔'' میں نے کہا اور آنکھیں بند کر کے کروٹ بدلی۔

''چائے بنا دوں..... سر درد کی گولی لا دوں؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔

''نہیں، بس سو جاؤں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' اس وقت مجھے اس کی مداخلت اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

وہ تھوڑی دیر چپ چاپ کھڑی رہی۔ پھر پلٹی اور کمرے کی بتی بند کر کے باہر چلی گئی۔

''امی! ابو نے کہا تھا کہ کھانا بھجوانا ہے۔'' مجھے باہر سے تحریم کی آواز آئی۔

''ہاں، ریحان کے ہاتھ بھجوا دیا ہے۔ تمہارے باپ کی کبھی کوئی بات مجھے بھولتی ہے بھلا؟'' زلیخا کا جواب مجھے سنائی دیا۔

میں آنکھیں بند کر کے دوبارہ زبیدہ کا تصور کرنے لگا مگر تصور میں کھنڈت پڑ گئی تھی۔ اندھیرا تھا مگر زبیدہ کے چہرے کی چاندنی ندارد تھی۔

مجھے الجھن ہونے لگی اور نہ جانے اس الجھن میں کب سو گیا۔

☆☆☆

عادت کے مطابق میری آنکھ تین بجے کھل گئی۔ مگر میری ہمت نہیں ہو رہی تھی اٹھنے کی۔ یوں لگ رہا تھا کہ جیسے سارا بدن تھکا ہوا، ٹوٹا ہوا، شل ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ جیسے میرا سارا بدن جل رہا ہے۔

اسی وقت زلیخا اندر آئی۔ ''ارے..... آپ اٹھ گئے۔''

''مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا۔'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

زلیخا نے قریب آ کے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور بولی۔ ''ارے، ماتھا تو بری طرح جل رہا ہے۔ آپ کو سخت بخار ہے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے آج جانے کی۔'' اس نے فوراً کہا۔

''مجھے پانی دو۔'' میں نے کہا۔

وہ جلدی سے باہر گئی اور پانی کا گلاس بھر لائی اور مجھے پانی کا گلاس دیتے ہوئے کہنے لگی۔ ''کتنی بار کہا ہے آپ کو کہ رات میں موٹر سائیکل پر نہ جایا کریں۔ گاڑی کھڑی رہتی ہے۔ وہ لے جائیں، نہ کچھ پہن کے جاتے ہیں۔ موسم بدل رہا ہے۔ سردی لگ گئی ہے آپ کو۔ میں بسکٹ لاتی ہوں چائے کے ساتھ کھا لیں۔ پھر دوا دیتی ہوں۔'' وہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔

''ابھی ایسی سردی کہاں۔'' میں نے کہا۔

''اب آپ پہلے جیسے نہیں رہے، جب سردیوں میں بھی ٹھنڈے پانی سے نہا لیتے تھے۔ عمر دیکھی ہے اپنی.....؟ اٹھاون برس ہو رہی ہے، اوپر سے نخرے۔'' وہ خفا ہونے لگی۔

''ذرا مجھے فون دو!''

''اچھا، اتنی رات کو کس کو فون کرنا ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہاری سوتن کو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''میری سوتن۔'' وہ جیسے اچانک بجھ سی گئی۔

مجھے غصہ آ گیا۔ ''کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ منڈی اسلم کو فون کروں گا کہ آج میں نہیں آ رہا۔ وہ اپنے حساب سے خرید و فروخت کر لے۔''

''اچھا۔'' اس نے فون میری طرف بڑھا دیا۔

میں فون پر اسلم سے رابطہ کر کے اسے ہدایات دینے لگا جبکہ زلیخا چائے لینے کے لیے چلی گئی۔ فون رکھ کے میں غسل خانے میں جا کر کلی کرنے لگا تو منہ کا ذائقہ عجیب ہو رہا تھا بخار کی وجہ سے۔

مجھے اماں یاد آ گئیں۔ بچپن میں جب بخار سے منہ کڑوا ہوتا تو وہ مجھے بہلاتے ہوئے کہتیں۔

''بیٹا! بخار کا کڑوا منہ تو مبارک ہوتا ہے۔ بیماری سے سارے بدن کی زکوٰۃ نکل جاتی ہے، جتنا زیادہ منہ کڑوا ہو گا اتنی ہی جلدی اچھے ہو گے۔''

اماں کو یاد کر کے میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

سچ ہے ماں کبھی نہیں مرتی!

زلیخا چائے لے آئی۔ ساتھ میں دو شامی کباب اور بسکٹ بھی تھے۔ ٹرے رکھتے ہوئے بولی۔ ''رات بھی بھوکے پیٹ سو گئے تھے۔ ٹھنڈ اور کمزوری سے بخار آ گیا ہے۔''

''آؤ تم بھی بیٹھو۔'' میں نے کہا۔

''اچھا.....'' اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور

UUNOVELS.COM

بولی۔ ''میں اپنی چائے لے آؤں۔''

اکثر وہ باورچی خانے میں ہی چائے پی لیتی تھی۔ وہ جلدی سے جا کر اپنی چائے لے آئی۔

''تم بھی تو کھاؤ.....'' میں نے ایک کباب اٹھا کے اس کو دیا۔

''آپ کھا لیجیے۔'' اس نے کہا۔ ''ابھی دوا بھی کھانی ہے۔''

''کھا لوں گا مگر تم یہ تو لو۔'' میں نے کہا۔ ''کیا میرے ہاتھ سے لینا اچھا نہیں لگا؟''

''اچھا کیوں نہیں لگے گا پر.....'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''پر کیا؟'' میں نے بسکٹ دانتوں سے توڑا اور چائے کا گھونٹ بھرا۔

''یہی کہ آپ کی اتنی توجہ مجھ پر ہوتی کہاں ہے۔'' وہ بولی۔

''ایسا مت کہو۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''کیا تمہیں کبھی کوئی تنگی ہوئی۔ میری طرف سے کوئی کمی، کوئی کوتاہی؟''

''کبھی نہیں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''پھر.....؟''

''پھر یہ کہ شاید میں سمجھا نہ سکوں اور آپ سمجھ نہ سکیں۔'' وہ بولی پھر اچانک اس نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''ارے، گولیاں تو میں باہر ہی بھول آئی۔''

وہ کپ رکھ کے تیزی سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔ میں چائے سے بسکٹ کھانے لگا۔ تھوڑی دیر میں وہ اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں گولیاں اور پانی کا گلاس تھا۔ میں چائے ختم کر چکا تھا۔

''یہ لیجیے اور اچھی طرح کمبل لپیٹ کے لیٹ جائیں۔ ابھی پسینا آئے گا تو بخار اتر جائے گا۔''

میں نے خاموشی سے گلاس اور گولیاں لے کر پانی سے نگل لیں اور لیٹ گیا۔

وہ کہنے لگی۔ ''آپ لیٹیں، میں ذرا باورچی خانے کے برتن سمیٹ لوں اور دروازہ بند کر لوں۔''

اس نے میرا کمبل درست کیا اور کمرے کی بتی بند کر کے باہر نکل گئی۔ میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا اور دوبارہ سو گیا۔

☆☆☆

صبح جب میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی دس بجا رہی تھی۔ میں اٹھ بیٹھا اور خود کو چھو کے دیکھا۔ بخار نہیں تھا۔ میں اٹھا اور غسل خانے میں چلا گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر آیا تو زلیخا کمرے میں تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خاکی لفافہ تھا۔ اس نے میری طرف لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''صبح آٹھ بجے کے قریب اسلم آیا تھا۔ آپ کی طبیعت کا پوچھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ آپ گہری نیند سوئے ہوئے تھے اس لیے آپ کو نہیں اٹھایا۔''

''یہ الماری میں رکھ دو۔'' میں نے الماری کی طرف اشارہ کیا۔

زلیخا نے الماری کھول کے پیسوں کا لفافہ اس میں رکھا اور میرا ماتھا چھوتے ہوئے بولی۔ ''اللہ کا شکر ہے بخار اتر گیا۔ کچھ کھانے کے لیے لاؤں؟ بھوک لگ رہی ہوگی۔''

''ہاں۔ تیز پتی کی چائے لے آؤ۔'' میں نے ہاں میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی کچھ کھانے کا جی نہیں چاہ رہا۔''

''اچھا ابھی لائی۔'' وہ جھپاک سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''ابو! اب آپ کیسے ہیں؟'' تحریم نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

''بالکل ٹھیک ہوں بیٹی۔'' میں نے کہا۔ ''آؤ میرے پاس بیٹھو۔'' میں نے اسے بلایا۔ وہ میرے پاس آ کے بیٹھ گئی۔

''تمہاری سسرال میں تو سب اچھا ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''سب اچھا ہے۔ ماموں میرا بڑا خیال رکھتے ہیں بلکہ بعض دفعہ تو ماموں میری وجہ سے ان کو ڈانٹ بھی دیتے ہیں۔'' وہ ہنسی۔ اس کے انداز میں بچوں جیسی معصومیت تھی۔

''بس بیٹا ہمیشہ خوش رہو۔'' میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ ہنسنے لگی۔

☆☆☆

میں گھر میں داخل ہوا تو صحن میں بیٹھی ہوئی زلیخا کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے برابر میں ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔

میں آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا۔

زلیخا نے مجھے دیکھ لیا اور بولی۔ ''آ جائیں۔ یہ ہماری ہی پڑوسن زبیدہ ہیں جو آج صبح ہی آئی ہیں اپنے مکان میں۔''

زبیدہ.....! جیسے میرے قدم اپنی جگہ گڑ کے رہ گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ حرکت کروں..... کھڑا رہوں، واپس مڑ جاؤں یا سامنے بیٹھ کر اس کو دیکھوں جس کو میں نے ہمیشہ یاد کیا۔

زبیدہ میری جانب پشت کیے بیٹھی تھی۔ اس کی پشت سے دوپٹے کے نیچے سے اس کی لمبی چوٹی جھانک رہی تھی۔

اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی نے مڑ کے میری طرف

دیکھا۔ مجھے لگا جیسے زبیدہ پیچھے مڑ کے دیکھ رہی ہو اور خالہ حمیرا اس کے پاس بیٹھی ہوں۔

برسوں پہلے کا منظر من وعن میرے سامنے تھا۔

''آیئے نا..... وہاں کیوں کھڑے ہیں؟'' زلیخا نے مجھے کھڑے دیکھ کے کہا۔ ''یہ اماں جی سے ملنے آئی تھیں۔ میں نے بتایا کہ.....'' زلیخا خاموش ہوگئی۔

میں آہستہ سے آگے بڑھا۔ زبیدہ نے ابھی تک چہرہ نہیں گھمایا تھا۔ میں آہستہ سے جا کر زلیخا کے برابر رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور اسے دیکھنے لگا۔

اسی وقت ریحان آیا اور اس نے کہا۔ ''امی! ذرا بات سنیے گا۔''

''اچھا میں ابھی آتی ہوں۔'' زلیخا اٹھ کھڑی ہوئی۔

''آپ باتیں کریں۔ میں ریحان کی بات سن کر آتی ہوں۔ ساتھ ہی چائے بھی لے آتی ہوں۔'' زلیخا کہہ کر چلی گئی۔

زبیدہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ دلکش ہوگیا تھا یا مجھے لگ رہا تھا۔

''تم کیسی ہو؟'' میں نے پوچھا اور محسوس کیا جیسے میری آواز سرتعش ہو رہی ہے۔

''آپ کیسے ہیں؟'' اس نے کہا۔ ''اماں جی کے انتقال کا بہت افسوس ہوا۔ وہ بہت اچھی تھیں۔'' زبیدہ نے کہا۔

''تم لوگ پلٹ کے ہی نہیں آئے؟'' میں نے دھیمے سے کہا۔

''اس وقت میرے اختیار میں کیا تھا؟'' زبیدہ نے جواب دیا۔ پتا نہیں کہ اس نے شکوہ کیا، بتایا یا پھر وقت کے نامہربان ہونے کا ماتم کیا۔

''بہرحال اچھا لگا.....'' میں نے کہا۔

''وقت بہت گزر گیا۔'' اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔

''امی! یہ کون ہیں؟'' اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی نے کہا۔

''یہ..... یہ.....'' زبیدہ نے رک رک کے کہا۔ ''یہ وہ جو ریحان آئے تھے نا صبح سبزی لے کر..... ان کے ابو ہیں۔''

''اچھا.....'' اس نے سر ہلایا۔

''یہ تو بالکل تمہاری کاپی ہے۔'' میں نے لڑکی کو غور سے دیکھا۔ ''بالکل اسی طرح تم دکھتی تھیں۔''

''آپ کو یاد ہے؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔ پھر مزید کہا۔ ''ریحان بھی آپ کا بیٹا بالکل ویسا ہی ہے جیسے پہلے آپ تھے۔'' زبیدہ نے دور کھڑے ریحان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہو بہو تم ہو.....'' وہ کہہ کر جیسے چونک سی گئی۔

پھر چپ ہوگئی۔ پھر لمحاتی وقفے کے بعد کہنے لگی۔ ''یہ میری بیٹی ہے..... ریشماں۔'' اس نے ایک نظر بیٹی کی طرف دیکھا جس میں پیار ہی پیار تھا۔ ''میرے جینے کا سبب.....''

''ہاں.....'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''جینے کے لیے سبب تو چاہیے ہوتا ہے مگر کیا جینے کے لیے صرف ایک ہی سبب ہوتا ہے۔ کوئی اور نہیں؟''

''کوئی..... اور.....'' زبیدہ نے جیسے بہت کھینچ کے لفظ ادا کیے۔ ''چھوڑیے۔''

ہم دونوں چپ ہوگئے۔ باتیں بہت تھیں۔ گفتگو کا ایک بھنڈار تھا مگر شاید کہنے کا یارانہ تھا۔

زلیخا چائے اور دیگر لوازمات کی ٹرے لے آئی اور ہماری طرف دیکھ کر بولی۔

''کیا بات ہے، آپ لوگ چپ چاپ بیٹھے ہیں؟''

''کیا کہیں، کہنے کو کچھ نہیں۔'' میں نے کہا۔

''صحیح کہہ رہے ہیں آپ..... بعض اوقات اچانک ملاقات ہو تو جیسے لفظ ایک دم اڑن چھو ہو جاتے ہیں اور ذہن خالی رہ جاتا ہے کہ کیا کہنا ہے، کیا سننا اور کیا بتانا ہے؟'' زلیخا کے انداز میں جیسے شوخی تھی۔

''کیا مطلب؟'' میں نے اسے غور سے دیکھا۔

''ارے بھئی جب ہمارے سامنے امتحان کا پرچہ آتا تھا تو جیسے چند لمحوں کے لیے سوال پڑھ کے لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ ہمارے لیے ہمارے ہی کورس سے بنا ہے۔ سارا ذہن بھک سے اڑ جاتا تھا۔ کئی منٹوں میں حواس قابو میں آتے تھے پھر امتحان شروع کرتے تھے۔'' وہ ہنس کے بولی۔

''صحیح کہتی ہیں آپ..... کچھ امتحان ختم ہو جاتے ہیں اور کچھ امتحان ہمیشہ جاری رہتے ہیں۔'' اس نے پتا نہیں کیوں اپنی بیٹی ریشماں کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اتنی زور سے کہ ریشماں کسمسا کر رہ گئی۔

''امی.....'' اس نے کہا۔ زبیدہ نے چونک کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''یہ چائے لیجیے اور یہ کباب بھی.....'' زلیخا نے کہا۔

''جی جی.....'' زبیدہ نے جلدی سے چائے کا کپ تھام لیا۔

میں نے خاموشی سے چائے ختم کی اور انہیں باتیں کرتا چھوڑ کے اپنے کمرے میں آ گیا۔ عجیب سی کیفیت تھی دل کی۔ جیسے کچھ ہو گیا، جیسے کچھ کھو گیا اور جیسے کچھ مل گیا۔ میں سوچ رہا تھا یا پتا نہیں میں اپنی جگہ پر تھا بھی یا نہیں۔ بعض اوقات جیسے اندر کوئی جذبہ ہی مفقود ہو جاتا ہے۔

UUNOVELS.COM

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب آپ اپنے آپ ہی میں اس قدر اکیلے ہو جاتے ہیں کہ گھبرا جاتے ہیں اور یہ گھبراہٹ اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اردگرد کیا ہو رہا ہے؟ میں بھی شاید ایسی ہی کیفیات سے دوچار تھا۔

تم آئی ہو اتنے انتظار کے بعد!

نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی قول و قرار!

پھر یہ زندگی ہمیں ایک دوسرے کے مقابل کیوں لے آئی؟ کیوں میرا انتظار مکمل ہوا..... لیکن!

لیکن کیا زبیدہ کو بھی کوئی انتظار تھا؟ میں اسی محور پر گھوم رہا تھا اور جواب ندارد۔

مجھے نہیں معلوم کہ کتنا وقت گزرا۔ گھنٹے، ہفتے یا سال۔ بعض اوقات وقت کی اکائیاں بھی تو گم ہو جاتی ہیں۔ مگر جب میں حواس کی دنیا میں واپس آیا تو کمرے میں گہرا اندھیرا تھا۔ قید جیسا۔ میں گھبرا کے اٹھ بیٹھا اور بیڈ سے پاؤں لٹکا کے بیٹھ گیا۔ اسی اثنا میں کمرے کا دروازہ کھلا اور روشنی کی ایک تیز بوچھاڑ اندر آئی۔ اس کے عقب میں زلیخا تھی۔

''تم.....''

''آپ اٹھ گئے؟'' زلیخا نے کہا۔ وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئی ''میں اندر آئی تو آپ سو رہے تھے۔ میں نے لائٹ نہیں جلائی، کمرے کا دروازہ بند کر دیا تاکہ شور کی وجہ سے آپ کی آنکھ نہ کھلے۔ تھوڑا آرام کر لیں۔'' اس نے طویل جملے ادا کر کے میری طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے، آپ خاموش سے ہیں؟''

''کچھ نہیں.....'' میں نے کہا مگر میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ ''پانی دینا۔''

زلیخا واپس مڑ گئی اور چند ہی منٹ میں پانی لے آئی۔ میں نے غٹا غٹ پانی اندر انڈیل لیا۔

''کیا بات ہے، آپ کو پسینا آ رہا ہے؟'' زلیخا نے کہا۔

''پتا نہیں کیوں طبیعت عجیب سی ہو رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''لگتا ہے کہ آپ کو نظر لگ گئی ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''بھلا مجھے کس کی نظر لگے گی؟''

''وہ جو ماں بیٹی آئی تھیں، کیا نظر بھر کے دیکھا تھا انہوں نے؟'' زلیخا نے کہا۔

''اب میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں جو نظریں لگ جائیں گی مجھے۔''

''آپ کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ آپ ستاون اٹھاون سال کے ہو گئے ہیں۔ پینتالیس سے زیادہ کے نہیں لگتے۔ ذرا اپنے آپ پر توجہ دیں تو دیکھیں کتنے جوان لگتے ہیں۔'' زلیخا نے کہا۔

''اپنے آپ پر توجہ دوں..... مگر کس کے لیے؟'' میں نے رواروی میں کہہ دیا۔

زلیخا کے چہرے پر ایک سایہ سا رینگ گیا۔ وہ چپ ہو گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے غلط بات کہہ دی ہے مگر تیر تو کمان سے نکل چکا تھا۔

''میرا مطلب ہے کہ تم تو ہو نا میرے پاس۔ بس جیسا ہوں ٹھیک ہوں۔''

''جی.....'' زلیخا نے کہا اور پھر خاموش ہو گئی۔

''امی.....'' باہر سے ریحان کی آواز آئی۔ وہ فوراً باہر نکل گئی۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا، رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔

☆☆☆

ڈاکٹر جمیل سے ہمارے بہت پرانے تعلقات تھے۔ انہوں نے اپنا کلینک ہمارے محلے سے باہر واقع سڑک کے ساتھ ہی بنا رکھا تھا۔ ملنسار آدمی تھے۔ ساٹھ ستر کے پیٹے میں تھے۔ مجھے ان کا فون آیا۔

''کہیے کیسے یاد کیا آپ نے؟'' میں نے رسمی سلام دعا کے بعد پوچھا۔

''بھابی جی کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''کیا ہوا انہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے ان کو کہا تھا کہ اپنے ٹیسٹ کرا لیں مگر انہوں نے شاید دھیان نہیں دیا۔'' ڈاکٹر جمیل نے کہا۔

''کون سے ٹیسٹ؟'' میں نے سوال کیا۔

''ان کے سینے میں تکلیف ہے۔ میں نے کچھ ٹیسٹ لکھ کے دیے تھے۔ پندرہ بیس دن ہو گئے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ انہیں یہ ٹیسٹ کروا لینے چاہئیں۔'' ڈاکٹر جمیل نے کہا۔

''کیا کوئی مسئلہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بھی اور نہیں بھی۔'' ڈاکٹر جمیل نے کہا۔ ''یہ تو رپورٹ آنے پر پتا چلے گا۔''

''میں ابھی معلوم کرتا ہوں۔'' میں نے فون بند کر دیا۔

''زلیخا۔'' میں نے آواز دی۔

''جی.....'' زلیخا دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

''ڈاکٹر جمیل کا فون آیا تھا..... کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں، بس ایسے ہی کچھ کھانسی تھی اور سینے میں درد تھا۔ انہوں نے فضول میں ہی بہت سے ٹیسٹ لکھ دیے۔

UUNOVELS.COM

پیسے ضائع ہوں گے....." وہ ہنسی۔

"یہ کیا بے پروائی ہے۔" میں نے کہا۔ "انہوں نے کبھی اس طرح فون کیا ہے کبھی پہلے۔ فوراً سارے ٹیسٹ کراؤ جو انہوں نے کہے ہیں۔"

"ارے بھئی، یہ بخار وغیرہ کا ٹیسٹ ضروری ہے کیا؟" اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔

"تمہیں اعتراض کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس مجھ سے نہیں کھائی جاتی ہیں کڑوی کسیلی دوائیاں۔"

"ریحان ....." میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے ریحان کو آواز دی۔

"جی ابو....." وہ تھوڑی ہی دیر میں آ گیا۔ "کہیے....."

"اپنی امی کو لے کر ابھی جاؤ اور ان کے سارے ٹیسٹ جو ڈاکٹر صاحب نے لکھ کے دیے ہیں..... کراؤ۔" میں نے کہا۔ "اور ان کی کوئی بات نہیں ماننا، کوئی بھی ٹیسٹ نہ چھوڑنا۔"

"جی ابو جی! میں نے امی کو پچھلے ہفتے بھی کہا تھا مگر انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔" اس نے ماں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "چلیں۔"

"اچھا بھئی....." زلیخا نے بے دلی سے کہا اور الماری میں سے چادر نکالنے لگی۔ وہ دونوں چلے گئے۔

بڑے بیٹے کی جب سے شادی ہوئی تھی، وہ بس اپنے بیوریشن کا ہو کر رہ گیا تھا۔ نیچے آنا اس نے بہت ہی کم کر دیا تھا۔ کبھی کبھی تو اس سے پورے پورے ہفتے ملاقات ہی نہیں ہو پاتی تھی۔ اس کے معاملات میں ہم لوگ کوئی مداخلت نہیں کرتے تھے۔ میرے قیاس کے عین مطابق وہ اجنبی ہو چکا تھا۔ اس کی بیوی گھلنے ملنے والی ہو ثابت نہ ہو سکی تھی۔ اس کا رویہ اتنا سرد ہوتا تھا کہ زلیخا اس سے بہت کم بولتی تھی۔ ہاں، کبھی کبھی وہ یہ ضرور کہتی تھی کہ آپ کا اندازہ درست تھا۔ پھر چپ ہو جاتی۔ میں ان دونوں کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

اچانک جیسے مجھے چائے کی طلب ہونے لگی۔ میں اٹھ کے باورچی خانے میں چلا گیا۔ ابھی میں نے چائے بنانے کے لیے پانی ہی رکھا تھا کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔

میں نے جا کر دروازہ کھولا تو زبیدہ کے ساتھ رہنے والی بڑی بی کھڑی تھیں۔ انہوں نے پہلی نظر میں مجھے پہچان لیا۔ میں نے سلام کیا۔

وہ جواب دے کر بولیں۔ "بھیا! اگر زحمت نہ ہو تو ذرا گھر چلے چلو۔ آج پھر کوئی بجلی کا مسئلہ ہو گیا ہے ہمارے گھر تو کوئی مرد ہے نہیں۔"

"اچھا....." میں نے کہا۔ "ذرا ٹھہریے میں چلتا ہوں۔"

"اچھا، میں جا رہی ہوں..... آپ جلدی آ جاؤ۔ یہاں ٹھہر کے کیا کروں گی۔ گھر پر بھی کوئی نہیں ہے۔ دونوں کے سوا۔ کوئی آئے جائے تو دروازہ مجھے ہی کھولنا پڑتا ہے۔"

"جی....." میں نے کہا اور وہ میرا جواب سنے بغیر مڑ گئیں۔

میں نے چولہا بند کیا اور کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے باہر آ گیا۔ گھر کی ایک چابی میرے کی رنگ میں ہمیشہ موجود رہتی تھی۔

میں نے دروازہ بند کیا تو وہ خود کار طور پر لاک ہو گیا۔ میں نے دروازے پر جا کر دستک دی تو دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ گویا بڑی بی دروازے سے ہی لگی کھڑی تھیں۔

میں نے سوئچ بورڈ دیکھا تو وہی سرکٹ بریکر بند تھا۔ غالباً وائرنگ بہت پرانی ہو گئی تھی جو ذرا سا لوڈ پڑتے ہی بریکر خود کار طریقے سے گرم ہو کر بند ہو جاتا تھا۔ میں نے سرکٹ بریکر کو آن کر دیا۔

"بھئی تم تو فوراً ہی خرابی پکڑ لیتے ہو۔ کیا تم سچ مچ الیکٹریشن نہیں ہو؟" بڑی بی نے دوبارہ پوچھا جو سوال وہ پہلے بھی کر چکی تھیں۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

"کیا میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے؟" بڑی بی نے چڑ کے کہا۔

"میں اپنے بیٹے سے کہہ دوں گا، وہ کل الیکٹریشن کو بلوا کے ساری وائرنگ چیک کروا دے گا۔" میں نے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے۔"

"اچھا مجھے اجازت؟" میں نے پوچھا۔

"لو بھلا، بغیر چائے پیے کیسے جا سکتے ہو۔ بی بی نے تو تمہارے لیے چائے کا پانی رکھا ہوا ہے۔" بڑی بی نے فوراً جواب دیا۔

"چائے..... لیکن....."

"ارے بھیا لیکن ویکن چھوڑو۔ تم لوگ تو بچپن کے ساتھی ہو۔ غیریت کیسی؟" انہوں نے چمک کر کہا۔

"چلو اندر چلو۔" وہ مجھ سے آگے آگے ڈیوڑھی سے نکل گئیں۔

میں ان کے پیچھے آہستہ قدموں سے چلتا ہوا صحن میں پہنچ گیا۔

"آیئے، اندر آ جایئے۔" ریشماں نے اندرونی دروازے پر کھڑے ہوئے کہا۔

میں اس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ کمرا جو چند دن پہلے اجاڑ نظر آ رہا تھا، اب سلیقے سے بیٹھنے کے لیے آراستہ تھا۔

UUNOVELS.COM

ایک جانب لکڑی کا جھولا تھا جس کو چھت کی زنجیروں سے معلق کیا گیا تھا۔ اس پر کشن لگے ہوئے تھے۔ اسی جانب ایک تخت بچھا ہوا تھا جس پر سفید چادر پڑی تھی اور ہلکے رنگ کا گول تکیہ رکھا ہوا تھا جبکہ درمیان میں صوفے اور ایک طویل شیشے کی میز تھی۔

میں ایک صوفے پر جا بیٹھا۔ ریشماں مجھے اندر بٹھا کے دوبارہ باہر چلی گئی۔

مجھے بیٹھے ابھی چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ زبیدہ اندر داخل ہوئی۔ اس نے سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے پیچھے ریشماں چائے کی ٹرالی لیے آ رہی تھی جس میں چائے کے ساتھ کچھ دیگر لوازمات بھی موجود تھے۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹھے رہیے۔'' زبیدہ نے کہا اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔

ریشماں نے ایک پلیٹ میری طرف بڑھائی اور ساتھ میں کباب کی پلیٹ بھی۔

''اتنے تکلفات کی کیا ضرورت تھی۔ بس چائے کافی تھی۔''

''چائے کافی تو نہیں ہوتی۔'' ریشماں نے برجستہ مداخلت کی۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

''تمہاری بیٹی بہت ذہین ہے۔'' میں نے زبیدہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

''کیا آپ سچ مچ بچپن کے دوست ہیں؟'' ریشماں نے پوچھا۔ ''مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔ آپ کو کیسا لگ رہا ہے۔۔۔؟''

''ریشماں! تم بہت بولتی ہو۔'' زبیدہ نے دھیمے سے کہا۔

''سوری انکل! آپ کو برا تو نہیں لگا۔'' ریشماں نے جلدی سے معذرت کی۔ ''میں تو بس یہی سوچ رہی ہوں کہ آپ لوگ برسوں پہلے کیسے ہوں گے۔ کیا باتیں کرتے ہوں گے؟ کیا کرتے ہوں گے؟''

''ہماری اتنی طویل دوستی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی ملاقات۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔

زبیدہ نے کچھ نہ کہا۔ چپ بیٹھی سنتی رہی۔

''تمہاری امی تو ان دنوں شاید تمہاری جتنی ہی ہوں گی یا شاید کچھ کم۔ بس چند ہی دن رہی تھیں تمہاری امی۔ پھر تمہاری نانی کے ساتھ واپس چلی گئیں۔''

''اچھا۔۔۔۔۔'' ریشماں نے یوں کہا جیسے اسے شدید مایوسی ہوئی ہو۔ ''یعنی کہ کوئی خاص نہیں۔''

''اب پتا نہیں تم کس خاص قسم کی بات کی توقع رکھتی تھیں؟''

''پتا نہیں۔'' ریشماں ہنسنے لگی۔

''کبھی کبھی نہ یاد رہنے میں بھی ایک یاد رہ جاتی ہے۔'' زبیدہ نے دھیمے سے کہا۔

''ریشماں۔۔۔۔۔'' باہر سے بڑی بی کی آواز سنائی دی۔

ریشماں باہر چلی گئی۔ کمرے میں ہم دونوں تنہا رہ گئے۔

چند لمحوں کے بعد زبیدہ نے کہا۔ ''چائے لیجیے نا۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔''

''تم۔۔۔۔۔ آپ بھی لیں۔۔۔۔۔'' میں نے کہا۔

''آپ تم کیوں نہیں کہتے؟'' اس نے کہا۔

''کیسی ہو؟''

''آپ کے سامنے ہوں۔''

''بہت وقت گزر گیا مگر تمہاری بیٹی کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے وقت ٹھہر گیا ہو۔''

''وقت کا کام تو بیت جانا ہے۔''

''ٹھیک کہتی ہو۔ مگر نہ جانے بعض جگہ وقت کیوں نہیں بیتتا۔''

''کہاں؟''

''یادوں میں۔''

وہ چپ رہی۔

کمرے کی خاموشی میں کبھی کبھی ہماری چائے کے ننھے ننھے گھونٹوں کی آوازیں سرسراتیں۔

''کیوں چلے گئے تھے تم لوگ؟'' میں نے پوچھا۔

''ابو کے بھائیوں نے دادا جی کے مرنے کے بعد جائداد کی تقسیم میں جھگڑا کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو دادا جان کی کوئی وصیت نہیں تھی، دوسرے سب لوگ ابو سے ناراض تھے۔ دادا کی زندگی میں تو کچھ نہ بول سکے مگر ان کے مرتے ہی سب لوگ اپنے اپنے چولے اتار کے سامنے آ گئے۔''

''سب کیوں ناراض تھے تمہارے ابو سے؟''

''امی کی وجہ سے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''امی اور ابو یونیورسٹی فیلو تھے۔ ایک دوسرے کو پسند کر لیا اور کورٹ میرج کر لی جبکہ سب کا خیال تھا کہ شادی خاندان میں ہونی چاہیے تھی۔ بس دادا ابو نے ہی ساتھ دیا مگر بھائی بہن بھاوجیں سب مخالف ہو گئے اور پھر ایک دن جھگڑا اتنا بڑھا کہ ابو نے ہمیں یہاں شفٹ کر دیا۔ یہ گھر نانا نے خریدا تھا، جب وہ اس شہر میں کاروبار کے سلسلے میں آتے جاتے تھے۔ بڑے ماموں نے کہا کہ یہ تمہارا حصہ ہے تم رہو مگر پھر صلح ہو گئی۔''

''صلح کی کوئی تو شرط ہو گی۔ اس قسم کی صورت حال میں سادہ سی صلح تو نہیں ہو سکتی۔'' میں نے سوال کیا۔

UUNOVELS.COM

''ہاں.....'' زبیدہ نے ایک گہری سانس لی۔ ''آپ نے صحیح اندازہ لگایا۔ صلح ہوئی مگر اس شرط پر کہ میرا رشتہ تایا ابو کے بڑے بیٹے سے ہوگا جو اس وقت عمر میں مجھ سے پندرہ سال زیادہ تھا۔ ابو نے محض اس لیے ہاں کر دی کہ خاندان چھوٹ نہ جائے۔ دو سال بعد میری رخصتی ہوگئی۔ شادی کے بعد پتا چلا کہ اس کی خاندان میں شادی نہ ہونے کی وجہ اس کا نفسیاتی عارضہ تھا۔ غصے میں وہ جنونی ہو جاتا تھا۔ بلا کا شکی مزاج تھا۔ نو برس میں نے جس اذیت میں گزارے ہیں، وہ میں ہی جانتی ہوں۔ بدن کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں اس کی مار پیٹ کے نشان نہ ہوں۔ پھر اللہ نے مجھے نجات دے دی۔'' وہ گہرا سانس بھر کے چپ ہوگئی۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

وہ کہنے لگی۔ ''میں نے بتایا نا کہ وہ غصے میں جنونی ہو جاتا تھا۔ اس کا نفسیاتی علاج چل رہا تھا۔ اسی دوران اس کو غصہ آیا اور اس نے اپنے سر کو دیوار میں دے مارا۔ اللہ جانے کہاں سر کے اندر چوٹ آئی، وہ بے ہوش ہوگیا۔ اسے اسپتال لے گئے مگر تین چار دن وہ بے ہوش رہ کر اسی حالت میں مر گیا۔ میں بیوہ ہوگئی۔ لوگ بیوہ ہونے پر غم سے مرنے لگتے ہیں مگر سچی بات یہ ہے کہ میں بے حد پُرسکون تھی جیسے میرے اوپر سے خوف اور وحشت کا ہالا ٹوٹ گیا ہو۔

''ان دنوں یہ پانچ برس کی تھی۔ امی اور ابو کا تو پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ دونوں میری حالت پر کڑھ کڑھ کر چلے گئے۔ ماموں نے پھر بڑھ کے تھام لیا اور اپنے گھر لے گئے۔ گزشتہ سال بڑے ماموں بھی گزر گئے۔ انہوں نے اپنے مرنے سے پہلے یہ مکان میرے نام کروا دیا تھا اور جو پیسے امی ابو کے تھے، وہ میرے نام سے سیونگ ڈیپازٹ کر دیے مگر ماموں کے انتقال کے بعد گھر کے دیگر افراد کی نگاہیں بدلنے لگیں تو میں نے سوچا کیوں دوسروں کے پاس پڑی رہوں اس لیے اماں بی کو لے کر یہاں چلی آئی۔ آگے جو قسمت.....''

زبیدہ چپ ہوگئی۔ کمرے میں گمبھیر سناٹا چھا گیا۔

''بہت تکلیف دہ زندگی ہوگئی تھی تمہاری۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''تقدیر کے آگے کس کا زور چلتا ہے۔ سب ہی بے بس ہیں ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے..... سب ہی وقت کے اسیر ہوئے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''چائے ٹھنڈی ہوگئی ہے دوبارہ بنواتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں.....'' میں نے جواب دیا۔ ''بس کافی ہے۔''

''آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اپنے دکھوں کی پوٹلی کھول کے بیٹھ گئی۔''

''کہنے سے دکھ ہلکا ہو جاتا ہے۔'' میں نے تسلی دی۔

''ہاں مگر ماہ و سال تو واپس نہیں آتے۔ زخم بھر جاتے ہیں، نشان نہیں جاتے۔'' میں نے اسے دیکھا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔

ایک چپ ہمارے درمیان کھڑی ہمیں ہی خاموشی سے تک رہی تھی۔

''اچھا میں چلتا ہوں۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''آیئے گا پھر۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''اگر مناسب سمجھیں۔''

میں نے اسے دیکھا اور پھر باہر نکل آیا۔ بعض باتوں کا فوری کوئی جواب نہیں ہوتا۔ وہ دروازہ جو برسوں پہلے میں نے بند کیا تھا وہ پھر سے کھل گیا تھا۔

میں نے واپسی پر دیکھا، نذیر کی بیٹھک کا دروازہ بند تھا۔ میں گھر آ گیا۔ ابھی تک ریحان اور زلیخا واپس نہیں آئے تھے۔ میں ان کا انتظار کرنے لگا۔

کوئی گھنٹے بھر کے بعد دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ریحان اور زلیخا آ گئے تھے۔

''کیا ہوا..... سارے ٹیسٹ ہوگئے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ابو! سارے ٹیسٹ ہوگئے ہیں۔ ایک ٹیسٹ کے لیے پرسوں بلایا ہے۔ اس کی رپورٹ پندرہ دن کے بعد ملے گی۔'' ریحان نے بتایا۔

''اب یہ تمہاری ذمے داری ہے کہ ماں کا کوئی بھی ٹیسٹ باقی نہ رہے اور شام کو ڈاکٹر جمیل سے بھی ملنا ہے۔'' میں نے کہا۔

''جی ابو..... میں امی کو لے جاؤں گا۔''

''نہیں، ڈاکٹر جمیل کے پاس میں لے جاؤں گا تمہاری امی کو۔'' میں نے جواب دیا۔

ریحان سر ہلا کے چلا گیا۔

میں نے کہا۔ ''تم اندر چل کے آرام کرو۔ بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔''

زلیخا نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور چپ چاپ اندر چلی گئی۔ اس کے چہرے سے تھکن مترشح تھی۔

☆☆☆

شام کو میں زلیخا کو لے کر ڈاکٹر جمیل کے پاس گیا۔

UUNOVELS.COM

حسنِ اتفاق سے اس وقت مریضوں کا رش نہیں تھا۔ دو چار مریضوں کے بعد ہی ہماری باری آ گئی۔ میں نے ڈاکٹر جمیل کو بتایا کہ آج ٹیسٹ کے لیے گئے تھے۔ ایک ٹیسٹ دو دن کے بعد ہوگا اور اس کی رپورٹ پندرہ دن کے بعد ملے گی۔

''سب خیریت تو ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''سب ٹھیک ہے لیکن احتیاط کر لینا بہتر ہوتا ہے اس لیے میں نے ٹیسٹ لکھ دیے۔'' ڈاکٹر جمیل نے خوش دلی سے کہا۔

پھر انہوں نے زلیخا سے مخاطب ہو کے کہا۔ ''دوائیں لے رہی ہیں نا آپ؟''

''جی بالکل۔'' زلیخا نے جواب دیا۔

اسی وقت ایک اور خاتون اندر داخل ہوئیں۔ انہیں دیکھتے ہی زلیخا اٹھ کے ان کی طرف چلی گئی۔ دونوں باتیں کرنے لگیں۔

میں نے ڈاکٹر جمیل سے پوچھا۔ ''صحیح بات بتایئے کیا مسئلہ ہے؟''

ڈاکٹر جمیل نے کہا۔ ''ابھی آپ انہیں بتایئے گا نہیں۔ ان کے سینے میں کئی ماہ سے درد ہے۔ دو ایک مرتبہ انہوں نے دوا لی لیکن پھر انہوں نے احتیاط نہیں کی۔ میرا اندیشہ ہے کہ کہیں ان کے سینے میں پرابلم نہ ہو اس لیے میں نے احتیاطاً ٹیسٹ لکھے تھے لیکن یہ توجہ نہیں دے رہی ہیں۔ اب خواتین میں یہ مرض بڑھتا جا رہا ہے۔''

''کیا؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''کہیں کینسر کا خطرہ تو نہیں؟''

''خدا کرے کہ میرا یہ اندیشہ غلط ثابت ہو لیکن زیادہ خواتین شرم و حیا کے باعث اپنے سینے میں، بغل میں ہونے والی گلٹی کو چھپا جاتی ہیں اور درد یا سوجن ہونے پر کوئی درد کش گولی کھا لیتی ہیں لیکن باقاعدہ علاج کے بغیر اس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔''

تھوڑی دیر کے لیے جیسے میں گنگ سا ہو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہوا۔ ایسا کیسے ممکن ہے۔

''یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' میں نے فکرمندی سے پوچھا۔

''دوسروں کی توجہ ہو یا نہ ہو۔'' ڈاکٹر جمیل نے کہا۔ ''لیکن ایسے مرض میں سب سے زیادہ شوہر کی محبت اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن.....'' میں نے کہا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ اول تو پہلے رپورٹس آنے دیں۔ دوسرے یہ کہ اب یہ ناقابلِ علاج مرض نہیں رہا۔ محبت، توجہ اور اچھی دوائیں یہ سب مل کر مرض کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ابھی آپ اپنی بیگم سے اس کے بارے میں کوئی بات نہ کیجیے گا۔''

ڈاکٹر جمیل نے خاتون سے مل کر واپس آتی زلیخا کو دیکھ کر کہا۔ میں نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔ ہم دونوں واپس آ گئے۔

''ڈاکٹر آپ سے کیا سٹر پٹر کر رہے تھے؟'' زلیخا نے چادر تہ کر کے الماری میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کہہ رہے تھے کہ آپ کی بیگم ابھی تک اتنی خوبصورت کیسے ہیں؟''

''کیا مطلب؟'' زلیخا نے ناراضگی سے کہا۔ ''ڈاکٹر جمیل ہرگز ایسی بات نہیں کر سکتے۔ وہ بہت مہذب آدمی ہیں۔''

''تو کیا میں غیر مہذب ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''اوہ..... میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔'' وہ جلدی سے بولی۔

مجھے ہنسی آ گئی۔

''اب چائے بھی پلاؤ گی یا نہیں؟'' میں نے مصنوعی خفگی کا مظاہرہ کیا۔

''ارے ابھی لائی۔'' وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں نے شکر کیا کہ وہ اس بہانے باہر چلی گئی ورنہ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو کے متعلق میں اسے کیا بتاتا؟

☆☆☆

تیسرے دن زلیخا کو ریحان دوبارہ ٹیسٹ کے لیے لے گیا۔ اس ٹیسٹ رپورٹ کا ہمیں پندرہ دن انتظار کرنا تھا۔

درحقیقت یہ ٹیسٹ اس بات کی تصدیق کے لیے تھا کہ کیا زلیخا کو بریسٹ کینسر ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کس اسٹیج پر ہے تاکہ اسی حساب سے علاج شروع کیا جا سکے۔

وہ پندرہ دن میں نے بڑی مشکل سے کاٹے اور انتظار کرتا رہا۔ پندرھویں دن میں خود رپورٹ لینے چلا گیا۔

رپورٹ لے کر میں سیدھا ڈاکٹر جمیل کے پاس پہنچا۔ انہوں نے تمام رپورٹس کا تفصیلی جائزہ لیا اور کہنے لگے۔

''مجھے افسوس ہے کہ آپ کی بیگم کو بریسٹ کینسر ہو گیا ہے۔ میں آپ کو ڈاکٹر منور مرزا کو ریفر کرنا چاہوں گا..... یا آپ اپنے طور پر کسی اور ڈاکٹر کو دکھانا چاہیں تو بہتر ہے۔''

میں خاموشی سے ان کی شکل دیکھتا رہا۔ ایک اندیشہ ہونا اور پھر اندیشے کی تصدیق ہو جانا زندگی کا بدترین مرحلہ ہوتا ہے۔

''مجھے احساس ہے کہ یہ کوئی اچھی خبر نہیں لیکن حوصلہ ہارنا اس مسئلے کا حل نہیں۔'' ڈاکٹر جمیل نے کہا۔ ''آپ کو اپنی بیگم کا حوصلہ بننا ہے۔''

UUNOVELS.COM

''جی.....'' میں نے آہستہ سے کہا۔

ڈاکٹر جمیل نے مجھے ڈاکٹر منور مرزا کا پتا لکھ کر دے دیا، میں باہر آ گیا۔

میں نے گھر آ کے ڈاکٹر منور مرزا کا نمبر ملایا۔ انہوں نے ڈاکٹر جمیل کے ریفرنس سے مجھے اسی رات نو بجے کا وقت دے دیا۔ میں نے شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔

''آپ کو کیا ہوا، خیریت تو ہے نا؟'' زلیخا نے پوچھا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کے چہرے کا رنگ بالکل پھیکا پڑا ہوا ہے۔ سب خیریت تو ہے نا؟'' اس نے پوچھا۔ اس کے انداز میں تشویش کا عنصر غالب تھا۔

''کوئی خاص بات نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تمہاری رپورٹس آ گئی ہیں۔ میں نے ڈاکٹر جمیل کو دکھائی ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر منور مرزا کو دکھانے کے لیے کہا ہے بلکہ آج ہی وقت بھی لے دیا ہے۔ رات نو بجے کا۔''

''ڈاکٹر جمیل تو خود ڈاکٹر ہیں، انہیں دوسرے... ڈاکٹر کو ریفر کرنے کی کیا ضرورت؟'' زلیخا نے مشکوک انداز میں پوچھا۔ ''کوئی خاص بات ہے کیا؟''

''دراصل ڈاکٹر جمیل جنرل فزیشن ہیں جبکہ وہ چاہتے ہیں اسپیشلسٹ سے رابطہ قائم کیا جائے تاکہ رپورٹ کے مطابق علاج کیا جا سکے۔''

''ٹھیک ہے.....'' زلیخا نے کہا۔

''پھر میں ذرا جلدی سے کھانا بنا لوں۔ ریحان آئے گا تو کھانا تیار ہو گا۔ اس کو بھوک بالکل بھی برداشت نہیں ہوتی۔'' وہ باہر جاتے ہوئے بولی۔ میں چپ رہ کر اسے دیکھتا رہا۔

گھنٹے بھر میں اس نے کھانا تیار کر لیا۔ ہم گھر سے نکلنے ہی والے تھے کہ ریحان آ گیا۔ ہم اس کو ڈاکٹر کا کہہ کر روانہ ہو گئے۔

ڈاکٹر منور مرزا کا کلینک شہر کے معروف علاقے میں تھا۔ میں نے استقبالیہ پر نام بتایا تو اس نے ہمیں مزید انتظار کرنے کی ہدایت کر کے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

انتظار گاہ میں ہمارے علاوہ کئی اور لوگ بھی موجود تھے۔ ان میں مرد و خواتین دونوں ہی شامل تھے۔ بعض میڈیسن کمپنیوں کے پبلسٹی اسٹینڈ بھی رکھے ہوئے تھے جن میں دواؤں کے متعلق لکھا ہوا تھا۔

زلیخا خاموشی سے بیٹھ کر جائزہ لینے لگی۔ اس نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ میں خاموش تھا۔ بعض اوقات جیسے لفظ گم ہو جاتے ہیں۔

تھوڑی دیر میں استقبالیہ سے ہمارا نام پکارا گیا اور ہم ڈاکٹر منور مرزا کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب ادھیڑ عمر کے سفید بالوں والے ایک مسکراتے شخص تھے جن کا چہرہ ہی امید جگا دیتا ہے۔

انہوں نے تمام رپورٹس دیکھیں اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''اگر آپ علاج کرانا چاہتے ہیں تو میری ایک بات دھیان میں رکھیے گا۔''

''جی ڈاکٹر صاحب فرمائیے۔'' میں نے جواب دیا اور زلیخا کی طرف دیکھا۔

وہ بھی پوری طرح ڈاکٹر منور مرزا کی جانب متوجہ تھی۔

''دوائیں، غذا، دیکھ بھال یہ سب اس علاج میں صرف پچیس فیصد کام کرتے ہیں اور پچھتر فیصد آپ کا اپنا زندہ رہنے کا طاقت ور جذبہ۔ یہ مرض ایسا ہے کہ اس کا نام سن کر ہی آدمی ہمت ہار جاتا ہے کہ اب میں ایک ایسے سفر پر چل پڑا ہوں جس کا انجام صرف موت ہے لیکن آج کی میڈیکل تاریخ ایسے لوگوں سے بھری ہوئی ہے کہ جنہوں نے اس مرض کا کامیابی سے مقابلہ کیا اور موت کو پیچھے دھکیل دیا۔'' ڈاکٹر منور مرزا نے خاموش ہو کر ہماری طرف دیکھا۔

''آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''جی بالکل.....'' میں نے فوراً جواب دیا۔

''اور آپ.....؟'' ڈاکٹر صاحب نے زلیخا کو بھی مخاطب کیا۔ ''آپ کا کیا فیصلہ ہے؟''

''زندہ رہنا کون نہیں چاہتا۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''بالکل۔'' ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ''ہم کو زندگی کا طاقت ور احساس ہی فتح دلاتا ہے۔''

''جی.....''

''ہم کل سے آپ کا علاج شروع کرنا چاہیں گے۔ کیا آپ تیار ہیں؟''

''بالکل.....'' میں نے جواب دیا۔

''تو ٹھیک ہے، آپ صبح نو بجے تشریف لے آئیں۔'' ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

''جی بہتر.....'' میں نے کہا اور ہم دونوں باہر آ گئے۔

واپسی پر زلیخا چپ چپ سی تھی۔ گھر آ کے وہ خاموشی سے لیٹ گئی۔ ریحان ہمارا منتظر تھا۔

''کیا کہا ڈاکٹر نے؟'' اس نے فوراً پوچھا۔

''کل سے باقاعدہ علاج شروع ہو گا۔'' میں نے بتایا۔ ''مختلف مختلف دورانیہ ہو گا علاج کا۔''

UUNOVELS.COM

''امی! آپ فکر نہ کریں، آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔'' ریحان نے ماں کا ہاتھ تھام کے کہا۔

''ہاں.....'' زلیخا نے آہستگی سے جواب دیا۔ ''تم جو ہو میرے ساتھ.....''

''آپ کے لیے کچھ کھانے کو لاؤں؟'' ریحان نے پوچھا۔

''فرحان ابھی نہیں آیا؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، بھائی دو دن کے لیے کسی کام سے باہر گئے ہیں اور بھابی اپنے گھر گئی ہیں۔'' ریحان نے بتایا۔

میں نے کہا۔ ''اگر کہو تو ابھی فرحان کو فون کر کے بلا لیتے ہیں۔''

''نہیں۔'' زلیخا نے فوراً انکار کر دیا۔ ''کسی ضروری کام ہی سے گیا ہوگا۔''

''تمہیں کچھ کھانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''خالی پیٹ ہو۔ دوائیں بھی لینی ہیں۔''

''کھانا تو میں بنا کے گئی تھی۔ ریحان گرم کر لے گا۔''

''امی! چٹپٹے تکے لے آؤں..... ابھی گیا اور ابھی آیا۔'' ریحان نے کہا اور فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہاں بالکل۔'' میں نے کہا۔

ریحان چلا گیا۔

اچانک زلیخا نے کہا۔ ''امی کہتی تھیں کہ وہ عورت خوش قسمت ہوتی ہے جو شوہر کی زندگی میں رخصت ہو جاتی ہے۔ اپنے شوہر کے ہاتھوں سے کفن دفن پاتی ہے۔''

''اچھا جی.....'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''یہ اچانک اس قسم کی گفتگو کیوں شروع کر دی آپ نے..... خیریت تو ہے نا؟''

''مجھے باتوں میں مت ٹالیے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''باتوں میں نہیں ٹال رہا بلکہ اندر سے مجھے غصہ آ رہا ہے۔ اس قسم کی باتوں کا کیا مطلب۔ زندگی اور موت کا تمام معاملہ اللہ پاک کے اختیار میں ہے۔ ہمیں صرف اور صرف اچھا سوچنا چاہیے۔''

زلیخا نے میری طرف دیکھا اور چپ ہو گئی۔

میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ زلیخا نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اس کا ہاتھ بہت سرد تھا۔

''کیا تمہیں سردی لگ رہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا پھر اچانک اس کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو ڈھلک آئے۔

''بری بات۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''ہمت نہیں ہارتے۔ تم تو بہت بہادر ہو۔''

وہ کچھ نہ بولی۔ بس اس کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو نکلتے رہے۔ میں خاموش رہا اور اسے رونے دیا۔ رونے سے بھی بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہو رہی تھی۔

بعض اوقات بات کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

کافی دیر کے بعد اس نے کہا۔ ''ایک بات کہوں؟''

''کہو۔''

''میں چاہتی ہوں کہ ریحان کی شادی کر دوں۔'' وہ دھیمے سے بولی۔ ''میری تو بڑی آرزو تھی کہ میں فرحان کی اولاد دیکھوں مگر.....'' وہ چپ ہو گئی۔

''مگر کیا؟'' میں نے کہا۔ ''ابھی ان کی شادی کو دو برس ہی تو ہوئے ہیں۔ بعض مرتبہ بچے لیٹ ہو جاتے ہیں، ابھی تو بڑی عمر پڑی ہے۔''

''نہیں، یہ بات نہیں۔'' اس نے آہستہ سے ماتھے پر سے میرا ہاتھ ہٹایا۔

''عارفہ بچہ پیدا ہی نہیں کرنا چاہتی۔ وہ کہتی ہے کہ فی الحال وہ اس جھمیلے میں پڑنا نہیں چاہتی اور.....'' وہ چپ ہو گئی۔

''تو کیا ہوا؟'' میں نے دھیمے سے کہا پھر مزید بولا..... ''کچھ فیصلے تو اولاد کو خود کرنے کا حق ہوتا ہے۔ اس میں، میں اور تم کیا کر سکتے ہیں؟''

''کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ یہ سب میرا کیا دھرا ہے۔ اگر میں آپ کو مجبور نہ کرتی تو یہ شادی نہ ہوتی۔ آپ کا کہنا کتنا درست ثابت ہوا کہ وہ گھریلو لڑکی نہیں ہے۔''

''دیکھو، جو ماضی میں ہو گیا، اس پر رنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت۔ ان کا جوڑ لکھا تھا سو ہو گیا۔ ہر شادی کا کوئی نہ کوئی سبب تو ہوتا ہی ہے نا۔ بس.....'' میں نے اس کو تسلی دی۔

''ہاں..... لیکن.....'' اس نے کہنا چاہا۔ مگر میں نے اس کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

''بس اب فضول باتیں چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ ریحان کے لیے تم نے کوئی لڑکی دیکھی ہے کیا؟''

''بس اچانک ہی.....'' اس نے میری طرف دیکھا ''مجھے اچھی لگی۔ کبھی خاموش، کبھی اداس کبھی کچھ۔ کبھی کچھ۔''

''کون ہے وہ خوش قسمت جسے اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کر رہی ہو؟''

''وہ.....'' اس نے کہا ہی تھا کہ کمرے میں ریحان داخل ہوا۔

''میں گرم تکے کباب لے آیا ہوں۔ بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔'' اس نے آتے ہی شور مچا دیا۔

''میں نکالتی ہوں۔'' زلیخا جلدی سے اٹھی۔

UUNOVELS.COM

''میں لاتا ہوں، آپ آرام کریں۔'' ریحان نے کہا۔

''اب میں ایسی بیمار بھی نہیں کہ اٹھ نہ سکوں۔'' وہ ہمارے منع کرنے کے باوجود اٹھ گئی اور ریحان کے ساتھ باورچی خانے میں چلی گئی۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ ریحان کے ساتھ ٹرے لے کر اندر آ گئی۔ بکوں کی خوشبو نے بھوک واقعی تیز کر دی تھی۔ ہم تینوں ہی کھانے میں مصروف ہو گئے۔

''امی! میں آپ کے لیے فائٹا لایا ہوں۔'' ریحان نے کہا۔ زلیخا کوک ٹائپ بوتل نہیں پیتی تھی۔

''بہت اچھا کیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا۔'' اس نے بیٹے کو محبت بھری نگاہ سے دیکھا۔

''بس آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں پھر گھومنے چلیں گے۔ خوب ہلا گلا کریں گے۔'' ریحان نے ہنس کر کہا۔

''اب یہ لاابالی پن چھوڑ دو۔ تمہاری امی تمہارے لیے کچھ سوچ رہی ہیں۔''

''مثلاً؟'' ریحان نے پوچھا اور ماں کی طرف دیکھا۔

''میں سوچ رہی ہوں کہ تمہاری شادی کر دوں۔'' زلیخا نے کہا۔

''ابھی سے؟'' ریحان نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ابھی تو میں نے سوچا ہی نہیں کہ یہ کام بھی ہوتا ہے۔''

''کیا تمہیں کوئی پسند ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، یہ تو آپ لوگوں کا کام ہے۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''ماں صدقے۔'' بے ساختہ زلیخا نے کہا۔ ''تم نے تو میرا سیروں خون بڑھا دیا۔''

''اگر کوئی پسند ہوتی تو کیا ہوتا؟'' ریحان نے ہنس کر پوچھا۔

''کچھ نہیں ہوتا۔ بس اس سے تمہاری شادی کر دیتے۔'' زلیخا نے آہستہ سے کہا۔

''امی! میں چاہتا ہوں کہ ہم سب مل جل کے رہیں اور اس کے لیے لڑکی وہ ہو، جو گھریلو ہو اور جو آپ دونوں کی عزت کرے، آپ کو پسند کرے۔'' اس نے کہا۔

مجھے بہت اچھا لگا۔ ریحان بہت سمجھداری کی باتیں کر رہا تھا۔

''تم نے پوچھا نہیں کہ لڑکی کون ہے؟'' میں نے اسے چھیڑا۔

''جب فیصلہ آپ لوگوں پر چھوڑ دیا ہے تو مجھے تحقیق کی کیا ضرورت؟'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے جیسے آپ دونوں مل کر میرا تو لگا رہے ہیں۔''

مجھے اور زلیخا دونوں کو ہی اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔

ان ہی باتوں کے دوران کھانا ختم ہو گیا۔ ریحان برتن سمیٹ کر باہر لے گیا۔

''چلو اب سو جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''صبح جلدی اٹھنا ہے۔''

''اچھا۔'' زلیخا نے کہا اور لیٹ گئی۔

رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے، میں نے نائٹ بلب جلا دیا اور لیٹ گیا۔ ذرا دیر بعد زلیخا نے میری طرف کروٹ بدلی۔

''کیا بات ہے نیند نہیں آ رہی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بس ایسے ہی۔'' اس نے کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر باتیں کرنے کا دل چاہ رہا ہے تو باتیں کرو۔''

''ایک بات پوچھوں؟'' زلیخا نے کہا۔

''پوچھو، ایک کیا دس باتیں پوچھو۔'' میں نے جواب دیا۔

''اگر میں نہ رہی تو کیا آپ دوسری شادی کریں گے؟'' اس نے میرے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

''کیسی بے تکی بات ہے؟ بہتر ہے کہ تم سو جاؤ۔'' مجھے غصہ آ گیا۔

''ناراض نہ ہوں..... لیکن بتائیے تو سہی۔''

''اچھا تو سنو۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہارا عادی ہو گیا ہوں۔ ہر چیز میں تمہاری عادت پڑ گئی ہے۔ میرا خیال نہیں کہ کوئی اور تمہاری جگہ لے سکے۔''

وہ چند لمحے مجھے دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ''میں بھی بس عادت بنی..... محبت نہیں!''

اس کا جملہ اتنا اچانک تھا کہ میں کچھ بول نہ سکا۔

''شاید میں تمہیں سمجھا نہیں پایا۔'' میں نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ''تم نے کسی بھی مرحلے پر مجھے کسی مشکل کا احساس نہیں ہونے دیا۔ کبھی کوئی ضد، غصہ، جھنجلاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ تم ایک مثالی عورت ہو۔''

''مثالی عورت۔'' اس نے دھیرے سے دہرایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں تھوڑی دیر اسے دیکھتا رہا، پھر میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

☆☆☆

صبح میری آنکھ ساڑھے سات بجے کھل گئی۔ میں نے الارم لگایا ہوا تھا۔ میں نے رات ہی اسلم کو کہہ دیا تھا کہ منڈی کا کام وہ دیکھ لے۔

میں نے زلیخا کو اٹھایا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ سامنے دیوار گیر گھڑی پر اس کی نظر پڑی۔ ''یا اللہ! میں اتنی بے خبر سوئی کہ آنکھ ہی نہ کھلی۔''

UUNOVELS.COM

''کوئی بات نہیں۔ میں نے اسلم کو رات ہی بتا دیا تھا کہ میں آج نہیں آؤں گا۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''اچھا .....'' وہ مطمئن ہو گئی۔ ''میں ناشتا بناتی ہوں۔'' وہ بال سمیٹتے ہوئے غسل خانے میں چلی گئی۔

ابھی وہ باورچی خانے میں ہی تھی کہ ریحان بھی تیار ہو کے آ گیا۔ ''ابو! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت پڑے تو آپ امی کے ساتھ رہیے گا میں لاتا رہوں گا۔''

''یہ ٹھیک رہے گا۔''

''کیا ٹھیک رہے گا؟'' زلیخا نے پوچھا۔

ہم باپ بیٹا باورچی خانے کے سامنے ٹی وی لاؤنج میں باتیں کر رہے تھے جہاں سے باورچی خانے میں کام کرتی ہوئی زلیخا ہماری باتیں سن رہی تھی۔

''امی! اسپتال ہمیں بھی جانا ہے۔'' ریحان نے کہا۔

''اور یونیورسٹی کون جائے گا؟'' اس نے پوچھا۔

''آج کوئی خاص کلاس نہیں ہے۔'' ریحان نے جواب دیا۔

''تمہارا یونیورسٹی کے بعد کیا ارادہ ہے؟'' میں نے ریحان سے پوچھا۔

''وہی جو آپ کر رہے ہیں۔'' ریحان نے بتایا۔

''کیا مطلب، تم آڑھت کرو گے..... ایم بی اے کر کے؟''

''تو کیا ہوا؟'' ریحان نے کہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا یہ کام برا ہے؟ اگر آپ لوگ نہ ہوں تو شہر کا شہر ترستا بھوکا رہ جائے گا۔ میں تو بس اسے ایک نیا رخ دوں گا۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''پاکستانی آلو، پیاز اور لہسن کی بڑی کھپت ہے مڈل ایسٹ میں۔ میں بیرون ملک ان چیزوں کو بھیجوں گا۔ آپ دیکھیے گا۔''

''بہت اچھے۔'' میں نے تعریف کی۔ ''یہ تو بہت اچھا پروجیکٹ ہے۔ گھر کا کام اور کیا چاہیے۔''

''بالکل۔'' ریحان نے کہا۔ ''میں اپنے ابو کے کام کو نیا انداز دوں گا۔ آپ دیکھیے گا کیا ہوتا ہے۔''

''ارے واہ! میرا بیٹا تو بہت سمجھ دار ہو گیا ہے۔'' زلیخا نے کہا جو ہم دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

''ظاہر ہے، بیٹا کس کا ہے۔''

''وہ تو ظاہر ہے کہ تمہارا بیٹا ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

تھوڑی دیر میں ناشتا لگ گیا۔ ہم تینوں ناشتا کرنے لگے۔ اسی دوران زلیخا نے کہا۔ ''آپ دونوں میری بات اچھی طرح سن لیں۔ مجھے اس طرح کا کوئی علاج نہیں کروانا، نہ تو میں گنجی ہونا چاہتی ہوں نہ ہی اپنا حلیہ خراب کرنا چاہتی ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' میرا ہاتھ کپ تھامے ہوا میں معلق رہ گیا۔

''آپ مجھے کیا بچی سمجھتے ہیں؟ کیا مجھے پتا نہیں کہ بریسٹ کینسر کیا ہوتا ہے؟'' اس نے غور سے ہم دونوں کو دیکھا۔

ہم دونوں چپ ہو گئے۔

تھوڑی دیر میں ریحان نے کہا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن دستیاب علاج سے فائدہ اٹھانا بھی تو کوئی برا نہیں۔ آخر یہ جدید میڈیسن انسانوں کی بھلائی کے لیے ہی تو ہیں۔''

''ہاں .....'' زلیخا نے سکون سے جواب دیا۔ ''میں جانتی ہوں۔ مجھے نہ بہلاؤ۔''

زلیخا کا لہجہ اتنا دوٹوک تھا کہ ہم خاموش ہو گئے۔

میں نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔ ''کیوں نہ ایسا کریں کہ آج ہی ہو آتے ہیں۔ وقت بھی لیا ہوا ہے اور تمہاری نہ سہی ہماری تسلی ہو جائے گی۔''

زلیخا چند لمحوں تک ہمیں دیکھتی رہی پھر فیصلہ کن انداز میں بولی۔ ''ٹھیک ہے، میں جب چاہوں گی چلی چلوں گی مگر آج نہیں۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔'' میں نے جواب دیا۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ کبھی ضد نہ کرنے والی زلیخا اتنی ضدی اور دوٹوک کیسے ہو گئی ہے۔

ریحان نے ناشتا ختم کر کے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنا ایک اسائنمنٹ مکمل کر لوں۔ اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔''

میں نے گردن کو اثبات میں جنبش دی۔ ریحان اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆☆☆

زلیخا نے نہ جانے کیا بات کی کہ ایک دن مجھے کہنے لگی۔ ''ذرا زبیدہ باجی کے گھر چلیں گے میرے ساتھ؟''

''ہاں چلو خیریت؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ریحان کی شادی زبیدہ باجی کی بیٹی ریشماں سے کر دوں۔ مجھے وہ لڑکی بہت پسند آئی ہے۔''

''کیا؟'' میں اس کی بات سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ چند لمحے تو مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

اس نے مجھے دیکھا۔ ''کیا آپ کو پسند نہیں ریشماں؟''

''نہیں .....'' میں نے جواب دیا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے لیکن میرا تو خیال تھا کہ تم اپنے کسی بھائی کی بیٹی لو

UUNOVELS.COM

گی۔ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔'' میں نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔

''اگر آپ کو کوئی اعتراض ہے تو رہنے دیں۔'' اس نے میرے چہرے پر نگاہیں جما کیں۔

میں نے کہا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر کیا وہ راضی ہو جائیں گے؟''

''کیوں نہیں۔'' زلیخا نے کہا۔ ''جب آپ کہیں گے تو وہ نہیں کریں گی۔''

''تمہیں اتنا یقین کیوں ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

وہ بولی۔ ''بس بعض اوقات احساس ہوتا ہے کہ کوئی شخص ہمارے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ وہ ہماری بات ہی نہیں ٹال سکتا۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے جرح کی۔ ''تمہیں کیونکر یہ اندازہ ہے کہ وہ بات مان لے گی؟''

زلیخا نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''بس کوئی وجہ نہیں۔ یقین ہے۔'' وہ بولی۔ ''اگر نہیں جانا چاہتے تو صاف منع کر دیں۔'' اس کے انداز میں غصہ تھا۔

میں چپ ہو گیا پھر میں نے کہا۔ ''اگر تمہیں اتنا ہی بھروسا ہے تو پھر جب کہو، چلتے ہیں۔''

''آج شام ہی۔'' اس نے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شام کو ہم دونوں میاں بیوی زبیدہ کے گھر پہنچے۔ وہ بہت خوش ہوئی اور حیران بھی کیونکہ ہم دونوں کبھی ان کے گھر اکٹھے نہیں آئے تھے۔

ہم لوگ ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔

''چائے یا ٹھنڈا کیا چلے گا؟'' زبیدہ نے خوش دلی سے کہا۔ ''مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا ہے کہ آپ دونوں میرے گھر آئے ہیں۔''

''جب ہم ایک ہی محلے میں ہیں تو آنا جانا تو لگا ہی رہے گا۔'' زلیخا نے کہا۔ ''اچھی سی چائے پلوا دیجیے۔''

زبیدہ نے اماں بی سے چائے بنوانے کے لیے کہا۔ تھوڑی ہی دیر میں ریشماں چائے کی ٹرالی لیے چلی آئی جو چائے کے ساتھ دیگر لوازمات سے بھری ہوئی تھی۔

''چلیں باتیں تو ہوتی رہیں گی، چائے تو لیں.....'' زبیدہ نے کہا۔

''ہم آپ سے ایک چیز مانگنے آئے ہیں۔'' زلیخا نے کہا۔

''کیجیے۔'' زبیدہ نے چونک کر کہا۔

زلیخا بولی۔ ''مجھے آپ کی بیٹی بہت اچھی لگی۔ اس کو مانگنے آئی ہوں اپنے بیٹے ریحان کے لیے۔''

''کیا؟'' زبیدہ کی آنکھوں میں حیرت بھر گئی۔ اس نے مجھے دیکھا پھر زلیخا کو۔

''آپ کی مہربانی لیکن.....''

''لیکن کیا؟'' زلیخا نے تیزی سے کہا۔ ''ابھی کچھ دن پہلے ہی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ اللہ اس کا نصیب اچھا کرے۔ تو ہم سوالی بن کر نصیب کی تھالی بن کے آئے ہیں۔ کیا آپ ہمیں خالی ہاتھ لوٹائیں گی.....؟'' زلیخا نے کہا۔ اس نے ''ہمیں'' پر خاصا زور دیا تھا۔

''مجھے کچھ سوچنے کی مہلت دیجیے۔'' زبیدہ نے کہا۔

''آپ ضرور سوچیں لیکن ہمارے حق میں۔'' زلیخا نے چائے کا گھونٹ لیا۔ زبیدہ مسکرا دی۔

زلیخا نے کہا۔ ''میرا بیٹا بہت نرم مزاج اور خیال رکھنے والا ہے۔ بالکل اپنے باپ کی طرح۔ وہ بہت خوش رکھے گا آپ کی بیٹی کو۔''

''جی میں جانتی ہوں۔'' زبیدہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میرے لیے خوش قسمتی ہوگی کہ آپ لوگوں سے ناتا جڑ جائے۔''

''میرے پاس وقت کم ہے۔'' اچانک زلیخا نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' زبیدہ نے حیرت سے سوال کیا۔

''میرا مطلب ہے کہ نیک کام میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ یہ جو تھوڑی سی، چھوٹی سی زندگی ہے ہمیں اس میں خوشیاں کشید کر لینا چاہئیں۔''

''جی ـــــ جی ـــــ بالکل۔'' زبیدہ نے فوراً کہا۔ لیکن اس کے انداز سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سمجھ نہیں سکی۔

''اچھا ہم چلتے ہیں، آپ ہمیں کل تک بتا دیجیے گا۔'' زلیخا نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلیں۔'' زلیخا نے میری طرف دیکھا۔

ہم دونوں انہیں خدا حافظ کہہ کر باہر آ گئے۔

گھر پہنچ کے میں نے کہا۔ ''تم نے کچھ زیادہ ہی جلدی نہیں کر دی ان سے جواب لینے میں؟''

''میں چاہتی ہوں کہ جلد سے جلد ریحان کا سہرا دیکھ لوں۔''

''اتنی مایوس کیوں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بچوں کی شادی سے تو مایوسی ختم ہو جائے گی۔ معروفیت مل جائے گی اور آپ مجھے مایوس سمجھ رہے ہیں۔'' زلیخا نے جواب دیا۔

''تمہاری منطق سمجھ میں نہیں آ رہی۔'' میں نے کہا۔

''میری طرف سے تمہیں اجازت ہے جس طرح چاہو کرو۔''

UUNOVELS.COM

''شکریہ.....'' زلیخا نے ہنس کر کہا۔

☆☆☆

زبیدہ راضی ہو گئی۔ اس نے بیٹی کے لیے ہاں کر دی۔ زلیخا نے کہا کہ اسے جہیز کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے مگر اس کے باوجود زبیدہ نے بیڈروم کا سارا فرنیچر دیا۔ ریحان نے ماں کی خواہش کو پورا کیا اور ریشماں بہت سادگی سے بہو بن کر ہمارے گھر آ گئی۔

ولیمے کے تیسرے دن ریحان نے کہا۔ ''امی! میں نے آپ کی بات مان لی۔ اب آپ ہماری بات مانیں۔''

''کہو بیٹا۔'' زلیخا نے مسکرا کے کہا۔

''اب آپ اپنا علاج کروانا شروع کیجیے اور پہلے سن لیجیے کہ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گا۔''

''بالکل صحیح۔'' میں نے فوراً کہا۔ ''اب کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ سب تم نے اپنی مرضی سے کیا۔ اب ہماری مرضی چلے گی۔''

زلیخا نے غور سے میری طرف دیکھا اور ہنس دی۔

''اس میں بھلا ہنسنے کی کیا بات ہے؟'' میں نے کہا۔

''خالی ہنس نہیں رہی ہوں، خوش ہو رہی ہوں کہ آپ نے اپنا استحقاق تو جتایا۔''

اس کی بات سن کر میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں سمجھا نہیں۔ کیا تمہیں میرا کہنا برا لگا؟''

''نہیں۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''پھر کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ تو ہر بات کے پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں۔'' اس نے اچانک جیسے جھنجلا کے کہا۔ میں خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

زلیخا کا علاج شروع ہو گیا۔ وہ چڑچڑی اور غصیلی ہوتی جا رہی تھی۔ یہ اس کے علاج کے ضمنی اثرات تھے۔ بعض لوگوں کے لیے یہ بہت مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ جب آپ کے بال جھڑنے لگیں اور چہرہ آہستہ آہستہ اندرونی کمزوری کا غماز بننے لگے۔

چھٹی کیموتھراپی کے بعد زلیخا نے کہا۔ ''میں اب نہیں جاؤں گی۔ میں سکون سے مرنا چاہتی ہوں۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اللہ نہ کرے کہ یہ وقت آئے۔'' میں نے کہا۔

''موت تو آنی ہے، اس سے کون بھاگ سکتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ ڈاکٹر نے میرا بریسٹ ریموو کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کسی عورت کے لیے یہ کتنی اذیت ناک بات ہے۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''لیکن زندگی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔ ہمیں تمہاری زندگی عزیز ہے، تم ہماری ضرورت ہو۔''

''عزیز ہو، زندگی عزیز ہے، ضرورت ہو۔'' زلیخا ہنسی۔ ''کیا تمہیں میرا کہنا برا لگا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ ''ضرورت ہی تو ہوں میں۔'' وہ کروٹ بدل کے منہ دیوار کی طرف کر کے لیٹ گئی۔

''زلیخا۔'' میں نے آہستہ سے اسے پکارا مگر اس نے جواب نہیں دیا۔

☆☆☆

یہ ریحان کی شادی کا دوسرا مہینا تھا جب میں نے زلیخا کو بہت خوش دیکھا۔

''کیا بات ہے، بہت خوش نظر آ رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بات ہی خوشی کی ہے۔'' وہ ہنس کر بولی۔ ''پتا ہے آپ کو ریشماں کی رپورٹ آ گئی ہے۔ میں دادی بننے والی ہوں۔'' وہ ہنسنے لگی۔

میں نے غور سے دیکھا، اس کے پیلے چہرے میں گلابیت جھلک رہی تھی۔

''ریشماں.....'' اس نے آواز دی۔

''جی امی.....'' ریشماں باورچی خانے سے نکل کر اس کے پاس آ گئی۔ ''کیا بات ہے؟''

''یہاں بیٹھو میرے پاس۔'' زلیخا نے بیڈ پر کھسک کر جگہ بنائی۔

''تمہارے ابو خوش ہیں۔'' وہ ہنسنے لگی۔ ریشماں کا چہرہ شرم سے سرخ پڑ گیا۔

''ارے بھئی انعام دیجیے میری بیٹی کو۔'' زلیخا نے کہا پھر مجھے دیکھا۔ ''اتنے غور سے نہ دیکھیں، میری بیٹی کو نظر لگ جائے گی۔''

اتنے میں ریحان بھی آ گیا۔

''بس اپنی بہو کے چکر میں اپنے بیٹے کو بھول گئیں۔'' اس نے لاڈ سے گلہ کیا۔

''میں تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں۔'' زلیخا نے پیار سے بیٹے کو دیکھا۔

''میری ایک خواہش ہے۔'' زلیخا نے کہا۔

''ایک کیوں آپ دس خواہشیں کیجیے۔'' ریحان نے شوخی سے کہا۔ اس کے چہرے پر بھی خوشی کے اثرات تھے۔

باپ بننے کی خوشی کچھ الگ ہی ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہم نے اس کائنات میں اپنا عکس چھوڑ دیا۔ اپنا آپ منوا لیا۔ اپنے ہونے کا ثبوت دے دیا۔

UUNOVELS.COM
UUNOVELS.COM

"اگر لڑکی ہو تو اس کا نام زلیخا رکھنا اور اگر لڑکا ہو تو اس کا نام ماجد رکھنا۔" پھر کچھ توقف کے بعد بولی۔

"دادا دادی کے نام پر۔"

"امی آپ سلامت رہیں۔ بچوں کے نام آپ ہی نے رکھنے ہیں، دو چار چھ آٹھ۔"

ریحان نے کہا اور شرارتاً بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ جھینپ گئی۔

"کیوں میری بیٹی کو تنگ کر رہا ہے۔" زلیخا نے پیار سے بیٹے کو ڈانٹا۔ ہم لوگ ہنسنے لگے۔

☆☆☆

لیکن..... لیکن زلیخا اپنے پوتے کو دیکھنے سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ پتا نہیں کیوں اور کیسے جس تیزی سے میری دنیا میں وہ آئی تھی، اتنی ہی خاموشی سے چلی گئی۔ گھر جیسے خالی ہو گیا تھا۔

ریشماں اپنی ماں کے پاس تھی۔ اس کے ہاں ولادت قریب تھی۔ گھر میں کوئی عورت نہ ہونے کے باعث میں نے اسے کہا تھا کہ تم اپنی ماں کے پاس رہو۔ ان معاملات میں سہارا بہت ضروری ہوتا ہے۔

ریحان رات گئے آتا تھا۔ فرحان تو پہلے ہی الگ تھلگ رہتا تھا۔ ماں کے بعد تو جیسے اس سے دوریاں بہت بڑھ گئی تھیں۔

رات حبس زدہ تھی۔ میں نے الماری کھولی۔ سامنے ہی زلیخا کے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ اس کے شلوار سوٹ، دوپٹے..... نیچے رکھی ہوئی چوڑیاں اور اس کے استعمال کا سامان۔ میں نے اس کا پٹ بند کر کے الماری کا دوسرا پٹ کھولا۔ پتا نہیں کیوں بہت عرصے کے بعد میں نے وہ ڈبا نکالا۔ وہ ڈبا جس میں میری یادیں بند تھیں۔

میں نے ڈبے کو نکال کے بیڈ پر رکھا پھر آہستہ سے اسے کھولا۔ اس میں ایک کاغذ رکھا ہوا تھا۔

'یہ تو میں نے نہیں رکھا۔' میں نے سوچا اور کاغذ اٹھا لیا۔ وہ خط تھا۔ زلیخا کا میرے نام۔

"سنیے جب یہ خط آپ پڑھ رہے ہوں گے تو اس کا مطلب ہوگا کہ اب میں آپ کے پاس نہیں ہوں اور پتا نہیں کہ آپ کی یادوں میں بھی ہوں یا نہیں۔ میں نے آپ کو بہت ٹوٹ کے چاہا۔ اتنا چاہا کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ آپ کے ہر چھوٹے بڑے کام کو میں نے عبادت سمجھ کے کیا لیکن میں آپ سے جوابی محبت کا گرم جوش اظہار نہ پا سکی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ آپ میرے پاس جسمانی طور پر تھے لیکن آپ کا دل اور روح کسی اور کے پاس تھی۔

یہ حقیقت مجھے اسی دن معلوم ہو گئی تھی.. جس دن آپ نے کہا تھا..... میں تمہیں زوبی کہا کروں۔ آپ مجھ میں کسی اور کو ڈھونڈ رہے تھے۔

میں ضرورت تھی۔ بیوی تھی۔ عادت تھی۔

بس آپ کی محبت نہیں تھی۔

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ آپ کس قدر مشکل زندگی گزارتے ہیں۔ میرے ساتھ رہتے ہیں مگر مجھے احساس تک نہیں ہونے دیتے کہ آپ میرے پاس ہو کر بھی میرے نہیں۔ بہت فنکار آدمی ہیں آپ۔

ساری زندگی میں آپ سے ملنے کے لیے ترستی رہی اور آپ کھڑکی کھلنے کے منتظر رہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ عورت جو آپ کی بیوی ہو، وہ آپ سے بے خبر رہ سکتی ہے؟ میری ساری محبت اور وفائیں اس ڈبے کے بھنور میں ڈوبتی رہیں۔ میں کس کے لیے جیتی؟ عورت کو صرف بچے، گھر، معاشی سکون ہی نہیں شوہر بھی چاہیے ہوتا ہے۔ محبت اور گرم جوشی سے بھرپور..... مگر آپ نے تو ساری زندگی مجھے عادت کی طرح اپنائے رکھا۔

اب میں نہیں ہوں۔ آپ آزاد ہیں۔

مگر کیسے آزاد؟

اب آپ کے سامنے زبیدہ ہے۔ ایک اپنے گھر میں۔ ایک ہمارے گھر میں..... ریشماں کی صورت۔ ایک زبیدہ آپ کی محبت..... آپ کی زوبی۔

ایک زبیدہ آپ کی بہو۔ آپ کی بیٹی۔

ساری عمر میں جس کرب میں مبتلا رہی، آپ کے پاس رہتے ہوئے بھی آپ کو نہ پا سکی۔ اب آپ نہ تو مجھے پا سکیں گے، نہ زوبی کو۔

آپ کی زلیخا۔ اگر آپ نے مجھے اپنا سمجھا۔"

خط میرے ہاتھ میں لرز رہا ہے، میری زندگی کپکپا رہی ہے۔

کیا مجھے خواب دیکھنے، اپنے دل کی کوٹھری میں کچھ بھی رکھنے کا حق حاصل نہیں تھا؟

زلیخا! آج تم نے مجھے واقعی اکیلا کر دیا۔ نہ تو میرے پاس تم رہیں نہ زبیدہ۔ مجھے اتنا خالی اور تہی دست کر کے تمہیں کیا ملا.. اور میں نے کیا کمایا؟

خط میرے ہاتھ میں لرز رہا ہے۔ میری زندگی کپکپا رہی ہے۔

⌘⌘⌘

UUNOVELS.COM